دار الثقلین
شہید ڈاکٹر جواد باہنر
الحادی راستے

فہرست

پیش لفظ

ثقافتی یلغاران زبردست خطرات میں سے ایک ہے جومختلف انداز اور صورتوں میں ہمارے اسلامی معاشرے کے لیے چیلنج بنے رہے ہیں۔اس ثقافتی یلغار کے زور کوتوڑنے اوراسلامی معاشرے کے حقیقی خدوخال برقرار رکھنے میں ان شخصیات کا ایک اہم کرداراور مقام ہے جومعاشرتی حالات کی گہری شناخت رکھتے تھےاور علمی ومعنوی خوبیوں سے آراستہ تھے۔اس سلسلے میں بہت زیادہ کام کرنے والی شخصیات میں سے ایک ڈاکٹر باہنر شہید کی ذات ہے۔انہوں نے حوزۂ علمیہ اور یونیورسٹی دونوں جگہ سے تعلیم حاصل کی اپنے اعلیٰ ترین علمی ومعنوی مقامات کی وجہ سے نوجوانوں کے اندررہ کرانکے ساتھ کام کیا۔اور اپنے دروس، تقاریر، مقالات اور کتابوں کے ذریعے بہت سی ضروریات اور مشکلات کا حل پیش کیا۔اسی طرح مشرق ومغرب کے تباہ کن فکری مکاتب کے مقابلے میں حقیقی اسلام کا دفاع کیا۔ان کی شہادت نے انکے علمی سرمائے میں مزید جاذبیت پیدا کردی۔

ثقافتی یلغار کے سخت ترین حالات میں مضبوط اور مستحکم دستاویز تلاش کرنے والوں کے لیے یہ علمی آثار ایک محکم ڈھال بنے ہیں۔

آپ کے سامنے موجود کتاب ان علمی آثار میں سے ایک ہے جوحقیقت کے متلاشی نوجوانوں کے لیے مرتب ہوئی تا کہ منحرف مکاتب کی ثقافتی یلغار کے مقابلہ میں اسلامی اعتقادات کا دفاع کیا جاسکے۔یہ کتاب ان تقاریر کا مجموعہ ہے جوانقلاب اسلامی کے اوائل

میں انجمن توحید کے زیر انتظام ''گذرگاہ ھای الحاد'' کے عنوان سے کی گئی تھیں۔ان تقاریر میں در حقیقت ایک قدیم بحث کو نئے اور اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

باہنر شہید کے علمی آثار کی تدوین واشاعت کرنے والے ادارے (ادارۂ تدوین و نشر و آثار شہید باہنر) کی طرف سے پیش کی جانے والی یہ چھٹی کتاب ہے۔ پہلی پانچ کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔انسان وخودسازی۔ ۲۔گفتار ھای تربیتی۔ ۳۔فرھنگ انقلاب اسلامی

۴۔مواضع مادر ولایت ورہبری۔ ۵۔اسلام برای نوجوانان

کتاب کے مباحث سے متعلق یہاں قارئین کی توجہ چند نکات کی جانب مبذول کرانا ہے۔

۱۔مطالب کی درستگی کے لیے کوشش کی گئی ہے کہ تقاریر کے متن میں کم سے کم تبدیلی لائی جائے۔اور بعض موارد میں جملے کی مناسبت سے ایک آدھ لفظ حذف یا اضافہ کیا گیا ہے۔

۲۔کتاب شناسی سے متعلق حوالہ جات اور حرف ''د'' سے مشخص شدہ حوالے دفتر کی جانب سے ہیں۔ جبکہ باقی تمام حوالے خود شہید باہنر کے ہیں۔ضرورت کے مطابق انہیں الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔

۳۔اگر یہ علمی آثار اس عظیم شہید کی زندگی میں شائع ہوتے تو یقیناً زیادہ مکمل اور آراستہ ہوتے۔ بنابریں کتاب کی خامیاں ہماری وجہ سے ہیں۔اور اسکی خوبیاں اسکے بلند مرتبہ بیان کنندہ کی ہیں۔ امید ہے کہ اربابِ نظر ان نقائص کو دور کرنے میں ہماری رہنمائی فرمائیں گے۔

آخر میں دعا گو ہیں کہ: پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی فتح وکامرانی اور سربلندی وسرفرازی کا ہم قریب سے مشاہدہ کرسکیں۔والسلام

ادارہ

مقدمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"قُلۡ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ۔ اَللّٰہُ الصَّمَدُ۔ لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ۔ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔"

مقدمتاً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنی گفتگو کے موضوع کو بحث، مذاکرے اور مطالعے کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ ہم اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ اس موضوعِ بحث سے مکمل طور پر انصاف کرسکیں گے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر جستجو کریں اس مسئلے کی جڑیں ڈھونڈلیں اور اس طرح آپ کے لیے آئندہ زیادہ مطالعے کی راہ ہموار کر سکیں۔ بنابریں بہتر ہے کہ اسے صرف ایک تجویز کے عنوان سے دیکھا جائے تاکہ آپ عزیزوں کی آئندہ کی تحقیقات اس مسئلے کو مرتب و منظم کرسکیں۔

موضوعِ سخن ہے، ملحدانہ راستے یا دوسرے الفاظ میں الحادی راستے اسکا مقصد کیا ہے؟

اسکا مقصد یہ ہے کہ طولِ تاریخ میں کائنات کی خلقت و ابتدا کے بارے میں انسانی میلان کی دو اصل بنیادیں ہیں۔

ایک گروہ کائنات کی ابتدا و خلقت کا قائل ہے اور انکے نزدیک کائنات اور اسکے

ظواہر تخلیق ہوئے ہیں یہ لوگ کائنات کو چلانے اور اسکی تدبیر سے متعلق کسی ایک یا ایک سے زیادہ قوت کے قائل ہیں جبکہ دوسرا گروہ ان باتوں کا انکاری ہے۔ یہ گروہ ملحد، خدا پرستی کا منکر اور کسی ماورائے مادہ ہستی کے وجود کے عقیدے کے خلاف مقاومت کرنے والا ہے۔ یہ مسئلہ ہمیشہ زیر بحث رہا ہے خصوصاً علوم وفنون کے احیاء (renaissance) کے بعد اس بحث نے ایک نئی صورت اختیار کرلی ہے۔

ہمارے زمانے میں بھی الحاد پر مبنی بعض فلسفی واجتماعی مکاتب موجود ہیں اور یہ ان مکاتب کے مدِ مقابل ہیں جن کی بنیاد ہی خدا پرستی پر ہے یا پھر وہ کائنات کے مبداء پر یقین رکھتے ہیں۔ کلی طور پر کوئی ایسا مسلک یا مکتب نہیں مل سکتا کہ جس کی فلسفی وفکری بنیادیں تو ہوں لیکن کائنات کی خلقت وابتدا کے بارے میں کوئی مثبت یا منفی رائے نہ رکھتا ہو یعنی ہم یقین کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کوئی فکری وفلسفی مکتب ان دو مسئلوں سے خالی نہیں یا کائنات کے مبداء کا قائل ہے یا منکر۔ ان روشوں کے بیان سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی آئیڈیالوجی، مکتب اور اعتقادات کی فکری وفلسفی بنیادوں کو پہچانیں اور ان پر کام کریں اور بحث ومباحثہ کر کے انہیں جانیں۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ ہم بے دینی والحاد کے عوامل، اسکی بنیادوں اور رویوں کے بارے میں بھی فکر ونظر سے کام لیں۔

علت نہیں۔۔۔راہ

ہم نے لفظ ''پس منظر'' کا انتخاب کیا ہے اور شائد راہیں بھی مناسب ہو۔ کیونکہ اگر ہم کہیں کہ علل۔ تو پھر بعد میں اندازہ ہوگا کہ ایک گروہ کے لیے جو چیز الحاد کا باعث بنتی ہے بعینہ وہی چیز دوسرے لوگوں کے لیے مبداء کا عقیدہ فراہم کرتی ہے۔ جبکہ علت ومعلول کے مسئلہ میں علت معلول سے جدا نہیں ہے۔ علت کے بعد معلول کا آنا بھی لازمی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک علت جس چیز کے وجود کا باعث ہے وہی اس چیز کی نفی کی بھی علت ہو؟ ہم

نے سوچا لفظ راہ کا انتخاب کریں یعنی معمولاً جو الحاد تک پہنچا ہے وہ ایک ایسے خاص راستے سے گزرتا ہے جو توحید کے لیے بھی ایک سازگار راستہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ملحد اسی راستے سے گزر کر الحاد تک پہنچتا ہے۔

الحاد اور کفر کیا ہے؟

بعض افراد ماورائے طبیعیات کے انکاری (۱) ہیں اور ملحد و بے دین ہیں۔ یہ انکار بعض اوقات علاقائی عادات و رسوم کی وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ ایسے معاشرے میں پیدا ہوئے جہاں خدا کا کوئی ذکر نہیں۔ ہمیں ایسے افراد سے کوئی سروکار نہیں۔ اس فلسفی و فکری بحث میں ہمارے مخاطب وہ افراد ہیں جو عمداً ایک طرح کے استدلال و منطق کے ساتھ اپنے راستے کا انتخاب کرتے ہیں اور مکتب اختیار کر لیتے ہیں اگرچہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو غیر جانبدار ہوتے ہیں اور مکتب یا عقیدہ انکے لیے اصلاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بعض ایسے بھی ہیں جو بالکل نیستی کا رجحان رکھتے ہیں اور مادہ و غیر مادہ کسی بھی اصالت کے قائل نہیں ہیں۔ البتہ ہمارا سروکار ایسے لوگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے فکر و استدلال اور ایک طرح کے حساب کتاب کے بعد بعض باتوں کا اقرار کیا ہے اور بعض سے انکار۔ انہیں ملحد کہا جاتا ہے۔ اور شاید قرآنی تعبیر کے مطابق کفر و کافر اسی لفظ الحاد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

ممکن ہے بعض کا یہ خیال ہو کہ کافر ہر اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو آسمانی ادیان میں سے کسی دین یا اسلام کو قبول نہیں کرتا ہو۔ مجموعی طور پر قرآنی آیات سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کافر ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو ارادی طور پر فکر و نظر کے بعد حق اور خدا کا انکار کرتا

۱۔ یعنی مادہ اور توانائی کے علاوہ دیگر چیزوں کا انکار کرتے ہیں اگرچہ وہ بھی مادہ ہی کی ایک قسم ہے یا مادے کے خواص میں سے ہے یا مادے ہی کے حکم میں ہے ہمیں اسکی فزکس یا فلسفی اصطلاح سے کوئی مطلب نہیں ہے ایسے لوگ توانائی و مادے کے علاوہ قوت، عقل، ارادے اور شعور پر اعتقاد نہیں رکھتے۔

ہے۔ وہ شخص قطعاً کافر نہیں جس کے مطالعات میں توحید نہ ہو اور اسکے کانوں نے کبھی نغمۂ توحید نہ سنا ہو اور نہ ہی وجود مبداء کے عدم کا ہر معتقد اور غیر معتقد کافر ہوتا ہے۔ ایک وہ ہے کہ جسے کبھی مسئلہ درپیش ہی نہیں ہوا جبکہ دوسرا وہ ہے جو اسکے غلط ہونے پر اعتقاد رکھتا ہے اور عمداً انکار کرتا ہے۔

جو لوگ الحاد تک پہنچے ہیں اور خدا کی نفی کرتے ہیں وہ کن راستوں سے گزر کر الحاد تک پہنچے ہیں؟ ہم نے اپنی فکری کاوش کے مطابق الحاد کی سات وجوہ 'راستے' راہیں یا گزرگاہیں تلاش کی ہیں یقیناً آپ احباب اس سے کہیں زیادہ تعداد میں ڈھونڈ نکالیں گے جس سے بحث زیادہ گہری اور پُرمغز ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ توقع بھی نہیں ہونی چاہیے کہ ہماری پیش کردہ ہر بات لازماً نئی اور جدید ہو۔ یہ اس موضوع بحث کو منظم کرنے کی ایک نئی کوشش ہے۔ یعنی ہر دو طرف سے تنقید اور اعتراضات بہت ہوئے ہیں، ہم نے ان مسائل کی باب بندی کی ہے اور کلاسیکل صورت دی ہے۔ ہم حقیقتاً یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ الحاد کی جڑیں کہاں سے پھوٹتی ہیں؟ ہم اسکی بنیادوں کو ڈھونڈنا چاہتے ہیں ان بنیادوں کو پالینے کے بعد یہ تحقیق کریں گے کہ کیا واقعی یہ بنیادیں اس قابل ہیں کہ انہیں اس ہدف اور نتیجۂ الحاد تک پہنچا دیتی ہیں یا نہیں؟

پہلا راستہ

سائنسی رجحان

الف: عمومی تصور

آخری صدی میں الحادی راستوں' روشوں اور بساطِ کار میں سے ایک سائنس پرستی ہے۔ سائنس کا کام نئے نئے علمی قوانین کا انکشاف اور عرق ریزی اور کوشش سے مظاہر طبیعت کے باہمی روابط کو دریافت کرنا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ کس طرح اس مسئلے نے بعض افراد کو الحاد کی طرف کھینچ لیا ہے؟

خدا پرستی کا ایک عمومی تصور یہ تھا کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کائنات کو خدا نے خلق کیا ہے۔ اور تمام امور خدا ہی چلا رہا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہم جتنے بھی مظاہر قدرت دیکھ رہے ہیں' کھلنے والا ہر پھول' حرکت کرنے والا ہر ستارہ' دریاؤں میں رواں ہر مچھلی' آسمان سے برسنے والی ہر بارش۔ یہ سب کچھ براہِ راست خدا کے ارادے سے ہے۔ اس نے چاہا کہ فلاں کے بچہ ہو' اس نے چاہا کہ سبزہ اُگے' اس نے چاہا کہ اِس درخت کے دو بار پھل لگے' اُس درخت کے ایکبار پھل لگے' اور کوئی درخت خشک ہو جائے' اسی طرح اس نے چاہا کہ اِس آدمی کا قد چھوٹا رہے اور اُس دوسرے آدمی کا قد لمبا ہو جائے' تو ایسے ہو گیا۔ خدا پر اعتقاد کی تفسیر اس طرح کی جاتی تھی کہ ہم کائنات میں جتنے بھی قدرتی مظاہرے دیکھتے ہیں یہ سب خدا کے ارادے اور مشیت سے وابستہ ہیں۔ طبیعات اور مادی

دنیا میں ان مظاہر کے کوئی علل واسباب وعوامل موجود نہیں ہیں۔

شاید آپ نے بھی اپنے روایتی ماحول میں دیکھا ہو کہ اگر بوڑھے دیندار لوگوں سے کوئی ایک چھوٹی سادہ علمی بات بھی کی جائے تو وہ قبول نہیں کرتے تھے۔ فرض کریں آپ نے ان سے یہ کہا ہو کہ بارش کی وجہ یہ ہے کہ سمندر پر سورج کی تپش سے پانی بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے' بخارات بادل بن جاتے ہیں' ہوا ان بادلوں کو اِدھر اُدھر لیے پھرتی ہے' ہوا کے درجہ حرارت میں تبدیلی جیسے عوامل سے پانی قطروں کی صورت میں تبدیل ہو کر نیچے گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس پر بزرگوں کا جواب یہ ہوگا کہ یہ کیا بکواس ہے؟ خدا بارش برساتا ہے' سورج بادل اور سمندر یہ سب کیا ہے؟ وہ سمجھتے تھے کہ ایسی باتیں کرنے سے ہم نے گویا خدا کے خلاف قدم اٹھایا ہے' یا اگر یہ کہا جائے کہ زلزلہ زمیں کے اندر کچھ تبدیلیوں کے ہونے کی وجہ سے آتا ہے' مثلاً زیر زمین گیسوں کی حرکت' گیسوں کے اندرونی دباؤ اور دھماکے یا زمین کے کسی ایک بڑے ٹکڑے کا سقوط وغیرہ زلزلہ آنے کی وجوہات میں سے ہیں۔ اس پر فوراً جواب ملے گا' جناب! خدا کی مرضی ہے کہ زلزلہ آئے یا نہ آئے۔ اور تم جو یہ کہتے ہو کہ گیسوں کے اوپر نیچے ہونے سے زلزلہ آتا ہے تو یہ بات خدا کے خلاف ہے۔ عام روایتی دینی ماحول میں خدا پرستی کے ایسے بے شمار مسائل ہیں۔

ب: یورپ کی سوغات

آپ جانتے ہیں کہ الحاد اپنی اس شکل وصورت میں یورپ ہی کی سوغات ہے۔ اسکے ساتھ کئی دوسرے مسائل نے بھی جنم لیا۔ یہ نشاۃ ثانیہ (renaissance) کے بعد کا ایک خاص پیداواری عمل (phenomena) ہے۔ یعنی دورِ مدرسیت (scholastic) اور کلیسا کے تسلط سے قرونِ وسطی کی تاریخ کے زخم خوردہ ہونے کے بعد کی پیداوار ہے۔ آپ نے بہت سنا ہوگا کہ کلیسا نے قرونِ وسطی میں کیا کچھ کیا۔ کس طرح قدامت پرستی اور فکری

جمود کو جنم دیا؟ فکر و نظر کے ثمرات اور علمی و فلسفی تحقیقات کا راستہ روکا' ان پر ایک خاص سختی اور تندی غالب تھی۔ وہاں فقط خدا کی بات کی جاتی اور پھر خدا کو کلیسا تک محدود کر دیا جاتا۔ مزید کلیسا کو بھی باپ' پادریوں اور قرونِ وسطیٰ کے مخصوص مدارس کے افکار ہی میں محدود سمجھا جاتا۔ درحقیقت غور و فکر اور تحقیق و جستجو کے تمام منابع کلیسا کے اندر سے لوگوں کو ملنے والے آئین اور منشور ہی کے گرد گھومتے تھے۔ ان سے ہٹ کر غور و فکر اور تحقیق کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا یہ سوچ پختہ ہو چکی تھی کہ جہاں کہیں انجیل عیسیٰ مسیح اور وحی کی بات ہو گی وہاں فکر کا کوئی کام نہیں' وہاں آنکھیں بند کر لی جائیں اور عقل پر پہرے لگا دیئے جائیں۔

جب نئی سوچ کی پہلی بجلی گری تو کلیسا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے' قرونِ وسطیٰ میں مدرسیت (scholastic) کے سیاہ دورِ حکومت کا خاتمہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ علم و سائنس کی بجلی ہے کہ جس نے خدا کے خلاف قیام کیا ہے۔ چونکہ کلیسا اپنے تئیں مظہرِ خدا تھا اور اپنے بتائے ہوئے طرزِ تفکر کو بھی وحی اور خدا کے ساتھ منسلک کرتا تھا۔ لہٰذا کلیسا پر گرنے والی بجلی خدا اور دین ہی کے خلاف سمجھی جاتی تھی۔

بنا بریں ایک طرف ارادہ و مشیتِ الٰہی کے بارے میں عمومی تصور اور عام دیندار لوگوں کے قلب و ذہن میں حاکمیتِ خدا کا تصور اور دوسری طرف لوگوں پر مسلط کلیسا کے سیاہ دور نے الحاد کے لیے راہ ہموار کی۔

ج: جدیدیت کا رجحان (modernism)

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ سائنسی ایجادات کا استعمال ایک طرح سے ماڈرن ہونے کا رجحان تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ نئے نئے فیشن اپنانا اور ماڈرن ہونا یہ خود ایک ایسا مسئلہ ہے کہ تقریباً تمام معاشروں اور طبقوں میں حتیٰ مذہبی گروہوں میں بھی سرائیت کیے ہوئے ہے۔ درحقیقت انسان اس چیز کے پیچھے ہے کہ روائتی مسائل اور اپنی سالوں پرانی مانوس عادتوں

کی ایک نئی تفسیر کرے، نئے معانی پہنائے، روشن فکری اپنائے، یہ اندر سے اٹھنے والی ایک خواہش ہے، ایک احساس ہے اور ہر ایک میں کسی نہ کسی صورت موجود ہوتا ہے۔ جب مسلسل علمی مطالب کشف ہو رہے ہوں، نئی روشنی چمک رہی ہو، نئے شگوفے کھِل رہے ہوں تو طبیعتاً دقیانوسی، آرام دہ اور سست روائتی طور طریقوں سے انسان اکتا جاتا ہے۔ نئے راستوں، نئی صورتوں اور جدید باتوں کو جاننے کے لیے انسان لپکتا ہے۔

سائنسی سوچ رکھنے والے کہتے ہیں کہ انسان دنیا میں بہت سارے مظاہرِ طبیعت دیکھتا تھا۔ آسمانی کُروں کی مانند جاندار، حرکت اور ایسے کئی دوسرے مسائل انکے مشاہدے میں ہوتے ہیں چونکہ علم نہیں رکھتا تھا اس لیے انکی علت نہیں ڈھونڈ سکتا تھا۔ لہٰذا غیر مؤثر، مرئی یا غیر مرئی چیزوں سے چمٹ جاتا تھا۔

مثلاً بعض لوگ سورج کی پرستش کرتے تھے۔ یہ سمجھ کر کہ تمام کام اسی نے انجام دیئے ہیں یا پھر ستارے، درخت، غار، فرشتوں جیسی ماورائی چیزوں، کئی قسم کے خدا اور دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی۔ پھر علم و سائنس کا ظہور ہوا اور ہر قسم کے سوال کا جواب مل گیا، جہانِ فطرت کے متعدد مسائل زمینی، فضائی اور بحری مظاہر کا بڑا واضح جواب ملا۔

لہٰذا وہ [سائنس سے متاثر افراد] کہتے ہیں کہ اب تمہارے لیے خدا پرستی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ تم ایک مجہول کو کشف کرنے کے درپے تھے۔ علم، تجربے، مشاہدے اور کوشش کے باوجود بھی جب اس تک نہ پہنچ سکے تو اپنے لیے ایک خدا بنا لیا۔ اور اسی سے دل خوش کر لیا۔

لیکن جب علم و سائنس کا ظہور ہوا تو تمہارے تمام مجہولات کا جواب مل گیا۔ فزکس، (physics) کیمسٹری، (chemistry) فزیالوجی (phisiology) بائیولاجی، (biology) جیالوجی (geology)، اسٹرانومی (astronomy) اور اسکے علاوہ کئی علوم نے کئی قسم کے فارمولے اور قوانین دریافت کر دیئے۔ لہٰذا اب کوئی چیز مجہول

نہیں ہے، اگر کچھ چیزیں مجہول رہ بھی گئی ہوں تو بھی زیادہ تر مسائل دریافت ہو چکے ہیں، اور جو رہ گئے ہیں انہیں لیبارٹریوں میں ٹیلی سکوپ اور مائیکروسکوپ کے ذریعے کوشش کریں گے کہ دریافت کرلیں۔ پس سائنس کا دور آنے سے خدا پرستی کا کوئی راستہ باقی نہیں بچا۔ الحادی راستوں میں سے یہ ایک راستہ ہے۔

سائنس پرستی اور الحاد کی تلقین

الحادی سوچ کے ساتھ لکھی جانے والی مختلف مکاتبِ فکر کی کتابوں میں قاری کو الحاد کی تلقین کرنے کے لیے سب سے پہلے علمی و سائنسی مطالب کی بھرمار کردی جاتی ہے۔ فضائی مسائل بیان کیے جاتے ہیں مثلاً ایٹم کے اندر موجود بے پناہ قدرتوں کی بات کی جائے گی، انواع واقسام کی امواج ولہروں پر وضاحت ہوگی۔ بادلوں اور کہکشاؤں کا ذکر ہوگا۔ ریاضی و ہندسہ کے مسائل اور باریکیوں میں قاری کو اتنا الجھا دیا جاتا ہے کہ اسکے ذہن میں علم کا ایک بڑا بت بن جاتا ہے۔ پھر لیبارٹریوں' کارخانوں یا مختلف بھٹیوں اور تجربہ گاہوں کی مثالیں پیش ہوتی ہیں۔ کئی ہزار درجۂ حرارت کا پیدا ہونا' فلاں سرعت و حرکت کا پیدا ہونا یا فلاں توانائی کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اور بار بار اس چیز کی تکرار ہوتی ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ ہمیں ان میں کہیں کسی غیر مرئی قوت کا نام ونشان نہیں ملا۔ یہ تمام مسائل حل ہو گئے اور تم جو اسکی وجہ ڈھونڈھ رہے تھے وہ بھی واضح ہو گئی۔ دماغ پر علمی مطالب کی اتنی بمباری کرتے ہیں کہ انسان خود بخود شیدائی اور فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اور فریفتہ ہو کر ایک بڑے بت' یعنی سائنس کا اس طرح اسیر ہو جاتا ہے کہ پھر اس سے ماورا' ہر چیز کو وہم وخیال سمجھتا ہے۔

حوزۂ علمیہ (قم) میں چند سالہ قیام کے دوران اپنے تھوڑے بہت مطالعات کے بعد اور الحاد کی بنیادی وجوہات پر مسلسل غور وخوض کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خدا کو رد

کرنے اور ماوراء کے انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جہانِ طبیعت کے مادی مظاہر کے علل و عوامل اور علمی قوانین و مسائل کی دریافت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مسائل میں سے یہ ایک اہم مسئلہ ہے لہٰذا ہم مختصراً اسی کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں۔

قرآن اور قانون علیت

ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ یہ سائنسی انکشافات بعض لوگوں کے لیے الحادی راستے اور راہ و روش پہ چل نکلنے کی علتوں میں سے ایک علت اس لیے بنے ہیں کہ ہمارے عام دینی لوگوں کا پہلے جو 'الوہی' تصور یا عام دینی رجحان تھا کہ خدا پر عقیدے سے مراد مادی اور طبیعی علل و عوامل کی نفی ہے۔ ہمیں اس بات پر قائم رہنا چاہیے اور غور و فکر کرنا ہے۔ یہ جو قرآن اور دوسری دینی کتابیں کہتی ہیں کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا ہم نے تمہیں اولاد دی اور اسی طرح کی دوسری باتیں۔ کیا ان سب کا مطلب یہ ہے کہ مظاہرِ فطرت کے درمیان علت و معلول کا کوئی رابطہ نہیں ہے؟ کیا جہانِ طبیعت میں کسی قسم کا نظم و حساب کتاب موجود نہیں؟ کیا خداوندِ متعال نے فطرت کے اندر کسی بھی طرح کے نظام اور حفاظت کا بندوبست نہیں کیا اور کیا ہر چیز ان سب کے بغیر براہ راست الٰہی ارادے اور مشیت سے وجود میں آتی ہے؟

اس سوال کا جواب ہمارے لیے واضح ہے۔ اسلام نے کہاں علل و اسباب کی نفی کی ہے؟ آپ قرآن کا مطالعہ کریں کتنی بار ارشاد ہوا ہے کہ مثلاً بارش ہوتی ہے تاکہ بارش کے ذریعے سبزہ اُگے' سمندر کے اندر کئی ذخائر بنادیئے ہیں تاکہ ان ذخیروں سے تم اپنی معیشت کا انتظام کرو۔(۱) مجھے چند مثالوں کی تلاش تھی لیکن دیکھا کہ ایسی سینکڑوں آیات موجود ہیں جو علل و اسباب کی نشاندہی کرتی ہیں جہان طبیعت کے اندر علت کے وجود کا

۱۔ قرآن سے نقل شدہ مضمون ہے۔(د)

اعتراف اور طبیعی مسائل کے درمیان رابطے کا ذکر کرتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اسکا اسکے ساتھ رابطہ ہے اور اسکا دوسرے کے ساتھ' اگر وہ نہ ہوتا تو یہ نہ ہوتا' اور اگر یہ نہ ہوتا تو وہ بھی نہ ہوتا۔ کئی قسم کے نباتات' پھل' غذائیں' حیوانات' آسمانی کرات' دریاؤں کے پانی اور جاری چشموں وغیرہ کا بار بار ذکر ہوتا ہے۔ اور ان سب کو آپس میں جوڑتا ہے۔ قرآن ان تمام مظاہر قدرت کو پرکھنے اور ان کی علتوں کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے اور بالصراحت اعلان کرتا ہے۔

"اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۔ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ۔"

"آفتاب و ماہتاب سب اسی کے مقرر کردہ حساب کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اور بوٹیاں بیلیں اور درخت سب اسی کا سجدہ کر رہے ہیں۔ اس نے آسمان کو بلند کیا ہے اور انصاف کی ترازو قائم کی ہے۔" (۱)

سورج اور چاند (اسکے نافذ حکم اور جاذبہ سوق سے) معین حساب کے تحت گردش میں ہیں' نباتات و درخت خاکِ اطاعت پر اسکے (حضور) سجدہ ریز ہیں' اس نے آسمان کو بلند کیا اور دنیا میں (عدل و نظم کا) میزان قائم کیا۔ میزان' انضباط' حساب و نظم کا قائم ہونا' اس بات کی وضاحت ہے کہ نظامِ خلقت میں حساب' قانون اور نظم موجود ہے۔

راویت میں ہے کہ جہان طبیعت کے مظاہر اور افعال بغیر کسی سبب کے انجام دینا خدا کو پسند نہیں (۲) کاموں کا (ایک خاص) طریقہ اور سبب ہوتا ہے خداوندِ متعال کسی کو اولاد نہیں دیتا جب تک تولد و تناسل یا ماں باپ نہ ہوں۔ اگر کہیں حضرت عیسیٰؑ کی سی مثال ملتی ہے جنکی ماں ہیں لیکن باپ نہیں تو قرآن اسے استثناء یا معجزے سے تعبیر کرتا ہے کہ اس

۱۔ سورہ رحمٰن ۵۵۔ آیات ۵ تا ۷

۲۔ ابی اللہ ان یجری الامور الا باسبابھا۔ بحار الانوار۔ ج ۲۔ ص ۹۰۔ کافی' ج ۱' ص ۱۸۳

میں بعض دیگر امور کارفرما ہیں حتیٰ اگر کسی جگہ کوئی عمومی یا روایتی قانون اور نظم ٹوٹتا ہے تو اسے قرآن ایک بڑی روایت شکنی سمجھتا ہے۔ اسے مزید آیت' علامت اور جھنجھوڑ دینے والی بات کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یعنی قرآن نے نظم و ضبط اور علل و اسباب پر اس قدر زیادہ زور دیا ہے کہ اگر کہیں ظاہری بے نظمی یا علل و اسباب میں معمولی خلل بھی نظر آئے تو اسے مکمل طور پر یا کسی دوسرے رُخ سے دیکھتا ہے اور اس کے لیے بالکل جدا عوامل بیان کرتا ہے۔ لہٰذا نہ صرف قرآن علل و طبیعی عوامل کا معترف ہے بلکہ اسلام اور تمام الٰہی ادیان نے کبھی علیت کی نفی نہیں کی۔ نمونے کے طور پر چند آیات پیشِ خدمت ہیں۔

"وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ" (۱)

"اور ہم نے ہواؤں کو بادلوں کا بوجھ اٹھانے والا بنا کر چلایا ہے۔" (۲)

"فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ ..." (۳)

اور ہم نے آسمانوں سے پانی برسایا تا کہ اس سے تمہیں (اور تمہارے حیوانات و نباتات کو) سیراب کریں (وگرنہ) تم پانی ذخیرہ نہیں کر سکتے تھے (اور نہ ہی ضرورت کے وقت پر جہاں چاہتے لے جا پاتے)۔

اس مقدس آیت میں ہوا اور بارش کے درمیان رابطے کو بیان کیا گیا ہے کہ ہوا اور بارش کے درمیان باہمی ارتباط ہے۔

۱۔ سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۲۲

۲۔ زیر بحث موضوع سے ہٹ کر عرض ہے کہ یہ آیت علمی پیش گوئی کرنیوالی آیات میں سے ایک ہے ان دنوں لوگ نہیں جانتے تھے کہ بعض درختوں کا تولیدی مادہ ہوا کے ذریعہ منتقل ہو جاتا ہے یہ مسئلہ چودہ سو صدی پہلے علمی حوالے سے شناخت شدہ نہ تھا۔

۳۔ پھر آسمان سے پانی برسایا ہے جس سے تم کو سیراب کیا ہے اور تم اس کے خزانہ دار نہیں تھے۔ سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۲۲

”اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ“

خدا نے زمین و آسمان کو خلق کیا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس پانی کے ذریعے زمین کے اندر سے پھل باہر نکالے (اُگائے) جو آپکی خوراک اور روزی ہیں۔

ہمارے لیے یہی ایک کلمہ کافی ہے کہ اَخْرَجَ بِہٖ پانی کے ذریعے پھل نمودار ہوئے یہ نہیں کہتا کہ ہم نے ارادہ کیا اور براہ راست پھل پیدا ہو گئے بلکہ پھلوں کا اُگنا علل و اسباب کے تحت ہے جن میں سے ایک پانی بھی ہے۔

”وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِہٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْکُ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔“

”اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہواؤں کو خوش خبری دینے والا بنا کر بھیجتا ہے اور اس لیے بھی کہ تمہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھائے اور اس کے حکم سے کشتیاں چلیں اور تم اپنا رزق حاصل کر سکو اور شاید اس طرح شکر گزار بھی بن جاؤ۔“ (۲)

یہ سب علیت کا اعتراف ہے کہ ”مُبَشِّرٰتٍ“ (۳) آپ کے لیے ہوا کی تبدیلی کی

۱۔ اللہ ہی وہ ہے جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اور آسمان سے پانی برسا کر اس کے ذریعہ تمہاری روزی کے لیے پھل پیدا کیے ہیں۔ سورہ ابراہیم ۱۴۔ آیت ۳۲

۲۔ سورہ روم ۳۰۔ آیت ۴۶

۳۔ دوبارہ اس بحث کو دوسرے رخ پر نہیں ڈالنا چاہتا کہ یہ ایک سائنسی پیش گوئی ہے کہ بارش کب آئے گی، کہاں موسم ابر آلود ہے ہوا کی مختلف جہتوں سے ”موسمیات“ والے کیا فائدہ اٹھاتے ہیں، بارش برسنے یا نہ برسنے میں ہوا کی سرعت مد نظر رہنا وغیرہ۔

نوید ہے جو بارش کا پیش خیمہ ہے یعنی ہوا، موسم کی تبدیلی اور بارش کے درمیان ایک رابطہ موجود ہے۔

"وَلِيُذِيقَكُم مِّن رَّحْمَتِهِ" اور دوبارہ اس لیے کہ تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرے موسم کی اس تبدیلی کو رحمت کا نام دیا گیا ہے اسی تبدیلی کہ جو طبیعی اثرات رکھتی ہے اور زندگی کے بہتر ماحول کے لیے سازگار ہے۔ البتہ میں علمی و سائنسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا اور شاید اس بارے میں زیادہ معلومات بھی نہیں رکھتا لیکن یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہوا اپنے تمام آثار کے ساتھ رحمتِ خدا ہے۔ اگر یہ طے پا جائے کہ ہوا رک جائے، گرم ہوا اوپر کی طرف اٹھے، ہوا کی تبدیلی اور موسموں کا فرق نہ ہو تو کیا ہوگا؟ اس طرح بحری جہازوں کی حرکت میں ہوا جو کردار ادا کرتی ہے اس لیے ہے کہ تم خدا کا فضل (رزق) تلاش کرو اور استفادہ کرو شاید خدا کی نعمتوں کے شکر گزار ہو جاؤ۔

گرج چمک اور بجلی کا بارش کے ساتھ رابطہ یا اس کا زمین کو ثمر دار کرنے کا مسئلہ ہماری اصل بحث سے متعلق نہیں ہے۔ ایسی متعدد کتابیں بھی موجود ہیں جو قرآن میں سائنسی مسائل پر لکھی گئی ہیں۔ حاصل بحث یہ کہ قرآن علمی و سائنسی قوانین کا قائل ہے اور جب یہ باور کراتا ہے کہ خدا بارش برساتا ہے تو اسکا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ [بارش برسنے کے عوامل میں] نہ ہوا ہے نہ سورج، صرف براہِ راست الٰہی ارادہ ہے، جو یہ کام انجام دیتا ہے۔

قرون وسطی کے انحرافات کا تاوان

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میں نہیں جانتا (کہ ایسا کیوں ہے؟) اگر قرون وسطی اور کلیسا نے افکار بشریت پر کوئی بلا نازل کی ہے اور یورپ کے لیے ایک تاریک دور ایجاد کیا تو اس کا دھواں ہماری آنکھوں میں کیوں پڑے اور یورپ کی فکری تحریکیں اور رجحانات من وعن براہِ راست ہمارے ماحول میں کیوں داخل ہوں؟

یورپ میں وقوع پذیر ہونے والے اکثر واقعات کے پیچھے تاریخی علل واسباب کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان پر معاشرتی حالات اثر انداز ہوئے اور فکری ونظریاتی رویوں کا ایسا رنگ لیا جو ہمارے معاشرے کے حالات اور ماحول سے نہ سازگار تھے اور نہ ہیں۔ ایسی امواج کیونکر ہمارے تعاقب میں ہیں کہ جن کے ابھرنے کے عوامل ہمارے ماحول میں موجود ہی نہیں۔

پس اگر قرونِ وسطیٰ' کلیسائی تعلیمات اور تدریس نے کوئی کھیل کھیلا تھا تو ہمارا معاشرہ ان مسائل کا شکار کیوں ہو؟

اسلام کا علمی نکھار

کلیسا کی حاکمیت اور یورپ کی قدامت پرستی اور فکری جمود کے عین اوج کے وقت اسلام کے علمی نکھار کا دور تھا۔ اگر دوسری سے چھٹی صدی ہجری یا آٹھویں سے بارہویں اور تیرھویں صدی عیسوی کا دور اسلام کے عروج کا دور سمجھا جائے تو یورپ کا یہ قرونِ وسطائی دور قتل و کشتار' فکری جمود اور تکفیر و تصدیق کا دور تھا۔ جبکہ عالمِ اسلام میں رصدگاہیں' یونیورسٹیاں اور لائبریریاں قائم ہو رہی تھیں۔ مختلف علمی بحث و مباحثے' کاوشیں اور تحقیقات ہو رہی تھیں۔ بحث و مطالعہ کے لیے یہ پس منظر ہے جس پر بہت کام ہو چکا ہے۔ ان صدیوں کے یورپی معاشرتی حالات ہمارے ماحول میں قطعاً موجود نہ تھے۔ (۱)

خدا پر ایمان میں سائنسی ترقی کا کردار

جس مسئلے کے بارے میں کوشش کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم حتمی اور ثابت شدہ تمام

۱۔ البتہ آخری صدیوں میں بعض اسلامی معاشروں میں یورپ کا یہ طرزِ فکر ایک دوسری شکل میں ظاہر ہوا ہے لیکن کم از کم اس دور میں ہم اس قسم کے طرزِ فکر کا شکار نہ تھے۔

طبیعی و علمی قوانین اور علل و اسباب کو قبول کرتے ہیں۔ کسی بھی حتمی قانون اور فارمولے کے خلاف بات نہیں کرتے۔(۱) اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنی تجلیاتِ وحی کے منافی سمجھتے ہیں(۲) علمی حدود جتنی وسیع ہوں گی اور سائنسی قوانین وضوابط جتنے زیادہ دریافت ہوں گے ہمارا خدا پر ایمان اتنا ہی زیادہ پختہ ہوگا۔ کیونکہ سائنسی قوانین کی دریافت سے مراد ہے نظام تخلیق کی زیادہ شناخت' مشیتِ الٰہی کی کارسازیوں کا گہرا ادراک اور ارادۂ الٰہی کے مختلف پہلوؤں کی آگاہی۔

ایک سادہ سی مثال جو شاید اس بارے میں بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی کارخانے میں داخل ہوتا ہے تو اپنے فنی و ماہرانہ علم سے مختلف مشینوں کے کام سے باخبر ہو سکتا ہے۔ مزید اس کارخانہ میں موجود مشینوں کے طریقۂ کار کے بارے میں جتنا زیادہ جانے گا اتنا ہی اسکے بنانے والے کی مہارت اور صلاحیت کا معترف ہوگا' اسکی زیادہ تعریف کرے گا۔ اگر آپ کارخانے کے کسی چھوٹے سے کل پرزے کی حقیقت جان لیں یا اسکے باریک ریاضیاتی حساب کو سمجھ لیں تو کیا اپنے آپ کو کارخانے ہی تک محدود رکھنے میں حق بجانب ہوں گے؟! اور اس کارخانے اور مشینوں کے بنانے والے کو مدنظر نہ رکھیں گے۔ یہیں سے دو طرح کی حرکت' خدا کی طرف بڑھنے کے لیے ہمارے سامنے آتی ہے۔ دوستوں سے میری گزارش ہے کہ ان پر کام اور غور وفکر کریں۔

سائنسی ایجادات کے دو فائدے

پہلا یہ کہ ہم کہتے ہیں قوانینِ طبیعت جتنے زیادہ دریافت ہوں گے اور فارمولوں پر فارمولوں کا ڈھیر لگے گا تو قوانین کی زیادہ شناخت ہمیں کائنات کے بامقصد اور منظم و مرتب

۱۔ تھیوری (THEORY) کے خلاف اور نہ مفروضہ (HYPOTHESIS) کے

۲۔ یہ خود سے ایک جداگانہ مکمل بحث ہے کہ قرآن میں کوئی بھی چیز سائنسی قوانین اور علم کے منافی نہیں۔

ہونے کا پتہ دے گی۔ مزید دور و نزدیک کے درمیان ایک طرح کے تعلق سے آگاہ کرے گی۔ حتیٰ مختلف زمانوں کے موجودات کے درمیان ایک تعلق' حال کی موجودات کا پچاس یا سو سال بعد موجودات کے درمیان رابطے کو ہم دریافت کر سکتے ہیں۔ جتنا زیادہ سائنسی قوانین کی اصالت' پختگی اور پائیداری کا اعتراف کریں گے اتنا ہی زیادہ کائنات کی حکمت کے قائل ہوں گے۔ لفظ حکمت کا ایک معنی استواری و پائیداری بھی ہے۔ بغیر حساب کتاب یا بے ربط اور ہوا میں نہیں ہے بلکہ منضبط' استوار اور محکم ہے۔ مظاہر قدرت پر حکم فرما حقائق اور باریکیوں کے بارے میں جس قدر زیادہ آگاہی ہوگی' اتنی ہی زیادہ فطرت کی شناخت کر پائیں گے۔ جتنا زیادہ علم ہوگا اتنا ہی خدا کے سامنے خضوع و خشوع بڑھے گا۔

"اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا"

"یہ صاحبانِ علم ہی ہیں جو پروردگار کے سامنے حالت خشوع میں رہتے ہیں [اور الٰہی قدرت و حکمت کے قائل ہیں]"(۱)

ہم آگاہی و شعور اور نظم و حکمت کے جو نشانات دیکھ رہے ہیں۔ آئیں دیکھیں کہ یہ نشانات کس کی طرف سے ہیں؟ کون ہے جس نے اس نظم' ترتیب اور شعور کو تجلّی بخشی ہے؟ یہاں قانونِ نظم کا مسئلہ درپیش ہوگا اور اس پر بہت کام ہو چکا ہے۔ ہم دنیا کے باہدف اور بامقصد ہونے سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نظم و ضبط کو جاری رکھنے والے اس کارخانۂ قدرت سے ماوراء بھی ایک ہستی ہے جو یہ نظم عطا کیے ہوئے ہے۔

۲ مظاہر طبیعت پر حاکم سائنسی قوانین کی دریافت سے حاصل ہونے والا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہم ایک فلسفی نظر پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ واقعی ایک مسئلہ ہے۔ ہم کیوں علمی حدود ہی کی قید میں رہیں؟ ایک ایٹم شناس کا کام ایٹم ہی سے متعلق ہوتا ہے۔ ہمیشہ الیکٹرون' پروٹان

۱۔ سورۂ فاطر ۳۵۔ آیت ۲۸

اور نیوٹران کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ کس پر مثبت چارج ہے اور کس پر منفی؟ انکی رفتار کیا ہے؟ ان الیکٹرون اور پروٹان کا اپنے ساتھ والے ایٹم کے ساتھ کیا رابطہ ہے؟ وہ ایٹم ہی کے اندر محبوس ہو جاتا ہے اور اسکی عظیم دنیا کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ ایک بائیولوجسٹ (BIOLOGIST) جانداروں اور زندگی کے بارے میں بحث کرتا ہے اور اپنی اسی جداگانہ دنیا میں محور ہتا ہے۔ ایک ماہر نفسیات کے لیے بحث کا اپنا ایک مخصوص میدان ہے وہ بھی کہتا ہے کہ میری دنیا ایک اور ہی دنیا ہے۔

ایک خاص حدود کے اندر گردش کرتے رہنا ہمیں وسعتِ نظر سے محروم کر دیتا ہے۔ اسپشلائزیشن (SPECIALISATION) کے نقصانات میں سے ایک یہ ہے کہ مثلاً ماہر نفسیات کو اپنے شعبہ کے علاوہ دیگر فزکس، کیمسٹری یا قضاوت کے مسائل سے غرض نہیں ہوتی وہ دوسری مہارتوں سے نابلد ہوتا ہے۔ مثلاً اچھا دوڑ نہیں سکتا کیونکہ اس کام کی مشق نہیں کی یا موازنہ کریں ایک لکھاری اور کاریگر کا۔ لکھاری کا کام فقط سوچنا اور لکھنا ہے جبکہ دوسرا فقط اپنے کام میں ماہر اور اسپشلسٹ ہے چونکہ اس نے ذہنی مشق نہیں کی لہٰذا غور و فکر کرنے اور لکھنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ البتہ میں اس مسئلے کی زیادہ تائید نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اس وقت جو بات زیرِ بحث ہے وہ یہ کہ تخصص (SPECIALISATION) سے انسان ایک سمت میں بڑھتا ہے اگرچہ یہ بھی ایک اچھی چیز ہے اور ہونی چاہیے۔

گزشتہ دور میں علوم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں بوعلی سینا کی کتاب قانون طب پر بحث کرتی ہے۔ (۱) مثلاً اس دور کی شناخت شدہ مختلف بیماریوں اور خون کے جریان کے اسباب اور علاج معالجہ موجود تھا اسکے مختلف طریقے بتائے گئے تھے۔ لیکن ابن سینا کی اسی طب کی کتاب میں ''علم النفس'' یعنی نفسیات

۱۔ ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ اس دور کا علمِ طب آج کی نسبت محدود تھا۔

پر بھی بحث کی گئی ہے یعنی بوعلی سینا ایک بلند نظریہ کا مالک ہے۔ مثلاً جب وہ کہتا ہے کہ نزلہ و زکام کے لیے فلاں دوائی بہتر ہے یا فلاں جڑی بوٹی وبا کا توڑ ہے عین اسی لمحے بیمار کی بہتری کے لیے آرام دہ اور پرسکون ماحول کی تاکید بھی کرتا ہے چونکہ وہ روحی و جسمانی دونوں پہلو دیکھ رہا ہوتا ہے جب اپنی فلسفہ کی کتاب یعنی ''شفاء'' لکھتا ہے تو ایک حصہ جہانِ طبیعت اور اس سے متعلقہ بحث کے لیے مختص کر دیتا ہے۔ مختلف النوع حیوانات' انکی خصوصیات اور خاک و معدن پر بات کرتا ہے۔(۱)

اس کے بعد وہ ماورائے طبیعت یعنی غیر مادی بحث شروع کرتا ہے۔ اسکے مدّ نظر انسان کا جسم بھی ہوتا ہے اور نفسیاتی و روحانی پہلو بھی۔ خاک اور ماورائے خاک (مادہ و غیر مادہ) دونوں پر تحقیق کرتا ہے اسکی مثال ایک ایسے شخص کی مانند ہے جو کسی کارخانے کو اسکے بیرونی اعتبار سے دیکھتا ہے کہ آیا کارخانے کا وجود صحیح ہے یا نہیں؟ کیا دوسرے کارخانوں کی نسبت یہ ترقی یافتہ ہے یا نہیں؟ چونکہ وہ ہدف و مقصد کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ لیکن ایک کاریگر جو کارخانے کے صرف آلات اور پیچ و مہرہ پر نگاہ رکھتا ہے کہ پیداوار اِدھر سے ہو رہی ہے اور اُدھر جا رہی ہے۔ اسکا کام صرف یہ ہے کہ نظر رکھے۔ مشین صحیح کام کر رہی ہے یا نہیں' ڈبوں پر پن لگی ہے یا نہیں۔ کارخانے کے اقتصادی اور معاشرتی مسائل سے کاریگر کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

بعض مفکرین یہ بحث کرتے ہیں کہ پھول کا رنگ سبز یا زرد کیوں ہوا ہے؟ اسکا بیج کیسے بنتا ہے؟ یا اسی طرح کے دیگر سوالات۔ لیکن اس سے بالاتر ایک بحث ہوتی ہے کہ آیا یہ پھول اس ماحول کے لیے مفید بھی ہے یا نہیں؟ کیا ہم اس پھول کی خلقت کے ہدف' مقصد اور نتائج کو جان سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ مسئلے سے بالاتر سوچتے ہیں اور اسکی جہت پر نظر

۱۔ اس دور کی علمی سطح کے مطابق جو معادن موجود تھے۔

رکھتے ہیں۔ ایک فلسفی نگاہ یہ ہے کہ اس پھول کی خاصیت کیا ہے؟ دیگر تمام پھولوں کے ساتھ اسکا رابطہ کیسا ہے؟ ہماری زندگی' روح اور فکر کی مجموعی صورت کے ساتھ اسکے رابطے کی نوعیت کیا ہے؟ ایسی نظر ایک بلند اور فلسفی نگاہ ہوگی نہ کہ علمی و سائنسی۔

ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم عالم طبیعت کے اندر جتنی بھی تحقیق اور کاوش کرلیں۔ جب ان تمام علمی مسائل کے مجموعہ پر ایک نگاہ ڈالیں گے تو ایک طرح کا نظم' ہدف' جہت' انضباط اور تمام حرکات میں ہم آہنگی دکھائی دیگی۔

سسٹم کی ضرورت

آیا یہی عالم طبیعت اور عناصر کی داخلی حرکت خود سے اپنے وجود کو قائم رکھ سکتے ہیں؟

یہاں ایک نئی بحث ہے اگرچہ ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن پھر بھی اس پر غور و فکر ضروری ہے۔ سسٹم سے متعلقہ علم میں فزکس کے حوالے سے ایک بحث ہے اگرچہ اسکا ایک حصہ فلسفے کی طرف لوٹ جاتا ہے۔(۱)

سسٹم کی بحث کہتی ہے کہ عالم طبیعت اور معاشرے میں پائے جانے والے طبیعی سسٹم ایسے عوامل اور نظام پر مشتمل ہوتے ہیں کہ جو آپس میں مربوط اور ایک ہی ہدف پر گامزن ہوتے ہیں۔ مثلاً انسان ایک طبیعی وجود ہے جس میں نظامِ انہضام بھی ہے' گردشِ خون کا نظام بھی ہے' اعصاب وغیرہ کا نظام بھی ہے' اگرچہ یہ سب مختلف نظام ہیں لیکن اس کے باوجود آپس میں مربوط ہیں اور ایک ہی سسٹم کو تشکیل دیتے ہیں۔ ایک کارخانے کو بھی سسٹم سے تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ اگر کسی سسٹم کی حرکت' تکامل اور رشد مقصود ہو تو اسکی مدد اور تغذیہ لازمی طور پر باہر سے ہونا چاہیے۔ وگرنہ ممکن ہے کچھ دیر کے لیے آگے رشد

۱۔ آپ جانتے ہیں کہ فزکس اور فلسفہ پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ فزکس کے بہت زیادہ وسیع مباحث فلسفی ہیں یعنی فزکس کے مباحث کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی ہیں۔

کرے، اپنی اندرونی قوت سے غذا حاصل کرے لیکن جونہی داخلی قوت ختم ہوگی یہ رُک جائے گا۔ چونکہ اسکی قوت وتوانائی مسلسل صَرف ہو رہی ہوتی ہے۔ اور آنتروپی (۱) کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے اگر باہر سے مدد نہ ملے تو سقوط کر جائے گا اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ ہم ایک انڈے کی مثال پیش کرتے ہیں، انڈا مکمل سسٹم ہے، چوزے کے لیے جب تک اندرونی غذائی مادہ موجود ہے وہ اپنی غذا اندر سے حاصل کرتا ہے۔ بعد میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اندرونی توانائی اور (داخلی) ذخیرہ (خوراک) ختم ہو جاتا ہے۔ اب اگر یہ بند سسٹم نہ کھلے اور دنیا کے ساتھ اپنا رابطہ بحال نہ کرے باہر سے غذا حاصل نہ کرے، باہر کی ہوا نہ لے تو فرسودہ و نابود ہو جائے گا۔ بند سسٹم ایک محدود مدت تک اپنی حرکت جاری رکھ سکتا ہے اور اگر مکمل ہونا چاہے تو ضروری ہے کسی دوسری جگہ رابطہ برقرار کرے اور وہاں سے اپنے لیے غذا حاصل کرے جب تک گاڑی میں پیٹرول یا ڈیزل نہ ڈالیں حرکت نہیں کرتی۔

دنیا بند سسٹم ہے یا کھلا؟

کیا دنیا ایک بند سسٹم ہے یا کھلا؟

اگر یہ دنیا دوسری دنیا کے ساتھ مربوط ہے تو اس دنیا کو بھی اسی دنیا میں شامل کر دیں گے۔ کیا دنیا صرف اپنے اندر ہی سے مدد حاصل کرتی ہے جو اتنی کہکشائیں پیدا ہوگئی ہیں؟ یہ عجیب وغریب نظام، حیرت انگیز ترتیب، مختلف النوع جھرمٹ کہ جن میں ہر دن، ہر لمحہ نئے منظومہ شمسی اور سیارگان کا اضافہ ہو رہا ہے کیا یہ سب صرف اپنے اندر ہی سے مدد حاصل کرتے ہیں یا پھر کسی اور جگہ سے بھی ان کی مدد ہوتی ہے اگر صرف اندر ہی سے مدد

۱۔ آنتروپی (entropy) ایک خاص اصطلاح ہے فرسودہ، کہولت اور داخلی قوت کے ختم ہونے کے معنی میں ہے۔

حاصل کرتے ہوں تو ہم نے کہا تھا کہ ہر بند سسٹم ایک خاص مدت تک زندگی برقرار رکھ سکتا ہے مگر یہ کہ آپ کہیں دنیا بھی ایک مدت تک قائم رہے گی اور بالآخر فرسودہ ہو کر نابود ہو جائے گی۔ یا پوری کائنات کے بارے میں ایک مخصوص تفسیر کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک خلائی حصہ یا دنیا کے ایٹم کا مرکزی حصہ اچانک ایک زوردار دھماکہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس خلائی حصے کے پھٹنے سے بننے والے بڑے بڑے ٹکڑے ایک دوسرے سے دور ہو گئے اور آہستہ آہستہ کہکشاؤں اور منظومۂ شمسی کی صورت اختیار کر گئے۔ اربوں سال میں تمام اندرونی قوت استعمال کر لینے کے بعد ان کی حرکت بند ہو گئی۔ اس وقت یہ دوبارہ مرکزی حصے کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ کچھ مدت کے بعد دوبارہ اندر سے ایک زوردار دھماکہ ہوتا ہے جس سے پھر ایک نئی دنیا وجود میں آ جاتی ہے۔

البتہ یہ باتیں کرنے والے اکثر یہ کہتے ہیں کہ شاید ایسا ہوا ہو' یعنی یہ ایک مفروضہ ہے۔ اگر آپ کائنات سے متعلق اس کے فرسودہ ہو جانے کے قائل نہیں اور اسے مسلسل ترقی وکمال کی جانب رواں دیکھتے ہیں۔ جو لوگ کائنات کے ختم ہونے کے قائل نہیں بلکہ اسے ابدی سمجھتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے باہر سے امداد ملے۔ ہم جو عالمِ طبیعت کے اندر محبوس ہیں۔ ہر کل پرزے کی حرکت پر علت' سبب یا نظام کے منتظر رہتے ہیں تو پھر وہ کونسی طاقت اور امداد ہے جو پوری کائنات' اسکے نظام' ہدف اور پیوستگی کے لیے اس بند سسٹم کو حرکت میں رکھتی ہے۔

یا کہا جاتا ہے کہ دنیا ایک بند سسٹم ہے جو آخر کار ایک روز ختم ہو جائے گا۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ دنیا زمانی اعتبار سے محدود ہے۔ یعنی ایک زمانے میں پیدا ہوئی اور اب ایک زمانے میں ختم ہو جائے گی' یعنی جاری وساری نہیں رہ سکتی۔ اسکی ایک ابتدا ہے اور وہ بھی محدود۔ اور جب دنیا محدود ہو گئی تو قانونِ علیت میں پھنس گئی۔ اب اس اصول (قانونِ علیت) کا جواب دینا ہوگا کہ کوئی بھی وجود بغیر خالق کے نہیں ہو سکتا۔ سب قبول کرتے ہیں

کہ اگر پہلے کوئی چیز نہ ہو اور پیدا ہو جائے تو اس کے لیے دلیل چاہیے کیونکہ کوئی بھی چیز خود بخود وجود میں نہیں آتی۔

اختتام، آغاز کی دلیل ہے

اس مطلب کی تکمیل کے لیے ہم یہاں ایک بات کہیں گے کہ ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ اگر اختتام ہے تو آغاز بھی ہے خاص طور پر جب حرکت اور تبدیلی بھی ہو۔

یہ حرکت، تبدیلی اور موت کی طرف بڑھنا ایک تحول و تبدیل ہے۔ یہ تحول و تبدل ایک مدت پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر اسکا آغاز ازلی ہوتا تو اب تک مدتوں پہلے یہ اپنا دور ختم کر چکا ہوتا۔ فرض کریں ایک انسان سو سال زندہ رہتا ہے یا کوئی جانور چند سال یا کسی منظومۂ شمسی کا عرصۂ حیات فلاں مقدار ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے مثلاً فلاں ستارے کی عمر دس لاکھ سال ہے، یعنی اس میں رونما ہونیوالی تبدیلیوں سے حساب لگاتے ہیں، چونکہ اس میں تغیر و تبدل ہوتا ہے لہٰذا اس کے آغاز کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ اگرچہ ہر چیز کی مدت ہوتی ہے جو حرکت میں ہو، تبدیل ہو رہی ہو۔ ایسی تبدیلی جو موت پر ختم ہو، تباہی و بربادی اور ہر چیز کے خاتمے پر منتہی ہو۔ کیونکہ تبدیلی کا ایک دور ہوتا ہے اگر اس کا آغاز ازل سے ہوا ہوتا تو یقیناً اربوں سال پہلے ہی اس کا دور ختم ہو چکا ہوتا۔ پس لازمی طور پر اس کا "آغاز" ہے اور چونکہ "آغاز و ابتدا" ہے لہٰذا علت بھی ہے۔

اسی لیے مادہ پرست اپنے تئیں مادۃ المواد کو ازلی قرار دینے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مادہ ہمیشہ سے ہے۔ چونکہ نقطۂ آغاز ایک کھرب سال پہلے ہی کا بنا لیں پھر بھی یہ قطعی علمی اصول فوراً لاگو ہوگا کہ کوئی بھی وجود بغیر علت کے نہیں ہوتا، کہاں سے اور کیوں ہے؟ ہم کہتے ہیں اگر ہمیشہ سے ہے تو کیا باقی رہے گا یا وقتی ہے؟ جو چیز متحرک ہو وہ وقتی ہوتی ہے۔ سورج کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زوردار دھماکوں کی وجہ سے اسکا وزن

روزانہ سات ملین ٹن کم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایک دن سورج تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اسی طرح دوسرے منظوماتِ شمسی بھی تباہ و برباد ہو جائیں گے ان کا دور اختتام پذیر ہے چونکہ ایک بند سسٹم کی داخلی قوت اسے ہمیشہ متحرک نہیں رکھ سکتی۔

عجیب روابط

کیا علتوں کی مکمل دریافت اور سائنسی قوانین ہمیں ایک وجود بخشنے والے اور منصوبہ بندی کرنے والے سے بے نیاز کر سکتے ہیں۔ کیا ایک خوبصورت ڈرائینگ کے رنگوں کی جزئیات کو پہچان لینا' اور اس میں استعمال ہونے والے ہنر کی مختلف باریکیوں کو جان لینا ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم ڈرائینگ بنانے والے کو بھول جائیں؟ اگر ہم کہیں کہ اس کارخانۂ قدرت اور دنیا کا داخلی نظام خود سے اپنے کو چلا رہا ہے تو پھر نظم اور شعور کا ہم کیا کریں گے؟

ایک عورت جس کا ابھی بچہ نہیں ہے اور ممکن ہے آئندہ دس سال بعد اس کے بچہ پیدا ہو اس کے سینے میں پہلے ہی سے ایک مخزن (پستان) کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اور اس مخزن کی نوک اس طرح سے بنائی گئی ہے کہ بچّے کے نازک منہ سے متناسب رہے۔ پس اگرچہ ابھی بچہ کا وجود نہیں لیکن ایک طرح کا رابطہ دکھائی دے رہا ہے۔ ابھی بچہ موجود ہی نہیں کہ ہم کہہ سکیں یہ مسئلہ مادے کے اندر سے پیدا ہوا ہے یا ماحول کے مطابق سازگار ہونے کے قانون کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ انسان ایسی مقصدیت ساری کائنات میں دیکھ رہا ہے۔(۱)

۱۔ شاید ان میں سے بعض باتوں کا مطالعہ آپ نے ان کتابوں میں کیا ہو۔ انسان۔ موجود ناشناختہ' رازِ آفرینشِ انسان یا ان جیسی دیگر کتابیں۔

تین مسئلے

ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی علم فقط کرۂ زمین اور سورج کے درمیان رابطے، فاصلے، سرعت اور زمین کی حرکت وسمت کو ہی بیان کرتا ہے۔ لیکن پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ فاصلہ، سرعت اور حرکت کی سمت اس قدر گہرائی کے ساتھ منظم ہوئی ہے کہ اس سے سرد و گرم موسم وجود میں آتے ہیں اور مناسب درجۂ حرارت سے ہریالی پروان چڑھتی ہے اور انسان زندہ رہتا ہے اور انسان کی زندگی کے لیے مناسب روشنی بھی مہیا ہوتی ہے۔ علم فقط ان فاصلوں اور اندازوں کا حساب لگاتا ہے لیکن ایک حکیمانہ وعارفانہ وفلسفیانہ نگاہ ان مختلف موجودات کے درمیان رابطہ وہدف دیکھ رہی ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر غور وفکر اور کام ضروری ہے کہ کیا یہ ہمیں ماورا کی طرف متوجہ کرسکتی ہیں؟

دوسرا اہم مسئلہ یہ کہ داخلی علتوں کا وجود ہمیں علت سے وجود کی جانب لانے والے مجموعے سے بے نیاز نہیں کرتا ہے۔ اگر کائنات کے تمام تر ذرات میں قانونِ علیت جاری ہے تو پوری کائنات میں بھی جاری ہے۔

اگلا مسئلہ یہ ہے کہ کیا کائنات کا کوئی اختتام بھی ہے یا نہیں؟ ابھی ہم اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر اسکا کوئی اختتام ہے تو یقیناً کوئی زمانہ بھی ہے اور اگر زمانہ ہے تو پھر حادث ہے اور وجود میں آیا ہے۔

ان چند مسائل پر کچھ غور وفکر کرنا ضروری ہے اور ہم اسے حل کرنے کے دعویدار نہیں ہیں، فقط بحث کو بیان کریں گے۔

دوسرا راستہ

رئیل ازم اور آئیڈیل ازم

(realism and idealism)

''سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ''

''ہم انہیں نشانیاں دکھائیں گے آفاق وکائنات میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ وہ (اللہ) بالکل حق ہے۔''(۱)

الحاد کے لیے جو دوسرا موضوع بیان کیا جاتا ہے وہ شناختِ علمی یا (realism) اور حقیقت پسندی وواقعیت بینی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نظریہ بھی دراصل خدا اور غیبی عوامل کی نفی کرتا ہے۔ دراصل یہ دو مسئلے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط رکھتے ہیں۔

سب سے پہلا مقدمہ جو انہوں نے بنایا وہ یہ کہ کہتے ہیں:

وہ چیزیں جن کا انسان معتقد ہونا چاہتا ہے اور انہیں قبول کرنا چاہتا ہے اگر ان کے متعلق علم بھی رکھتا ہو تو کیا یہ بہتر ہے یا صرف خیالاتی، تصوراتی اور ذہنی شناخت کافی ہے؟

اس کا جواب واضح ہے کہ علمی رغبت ہونی چاہیے اور انسان کے لیے اس چیز کا علم ہونا ضروری ہے جس کا وہ پابند ہونا چاہتا ہے۔

۱۔ سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۵۳

دوسرا مقدمہ جو وہ لوگ بناتے ہیں کہتے ہیں کہ: صرف مادہ (matter) ہی وہ چیز ہے جس کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے کیونکہ علم وہ چیز ہے جو تجربہ و مشاہدہ اور حس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور یہ فقط مادہ ہے جسے تجربہ گاہ میں مشاہدہ اور لمس کیا جا سکتا ہے۔ جو چیز مادہ نہیں وہ قابل تجربہ و مشاہدہ نہیں ہے۔ جبکہ غیر مادہ وجود علمی شناخت کے قابل بھی نہیں، لہٰذا تصوراتی ہے۔ پس جو بھی غیر مادی وجود کا معتقد ہے وہ آئیڈیالسٹ (idealist) ہے، خیالی و تصوراتی ہے۔

آپ کی نظر میں کیا اس دلیل کی گہرائی میں ایک طرح کا مغالطہ اور قیاس نہیں ہے؟ یہاں دو مسئلوں کو ایک ساتھ مخلوط کیا گیا ہے۔

ایک مسئلہ شناخت ہے اور دوسرا مسئلہ رئیل ازم (realism) ہے

علم کے لیے دو مفہوم

پہلی بات تو علم کے مسئلے میں فارسی ادبیات میں ایک غلطی ہوگئی ہے دیگر زبانوں میں عموماً علم کے دو مفہوم ہیں اور ان دو مفاہیم کے لیے دو اصطلاحیں موجود ہیں:

علم کا ایک مفہوم وہی یقین، دلائل سے باور کرنا اور مضبوط آگاہی، واضح اور روشن آگاہی جو کہ گمان، تخمین، حدس، تردید، اور رائج اعتقاد کے مدِمقابل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے آگاہی، یقین اور علم کے ساتھ کسی چیز کو قبول کرلیا ہے۔

انگریزی زبان میں علم کے اس مفہوم کو knowledge کہا جاتا ہے: یعنی وہ علم جو یقینی ہو اور تردید و حدس و گمان کے ساتھ نہ ہو۔

علم کی ایک اور قسم علمِ خاص ہے جو مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتا ہے انگریزی زبان میں اس علم کے مفہوم کو science کہا جاتا ہے۔ جس میں تجرباتی علوم جیسے علم کیمیا، فزکس وغیرہ شامل ہیں یعنی وہ چیزیں جنہیں آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اور

لمس کیا جاسکتا ہے۔

لیکن ان دو کلمات کو جب فارسی میں ترجمہ کیا گیا تو دونوں کو علم و دانش کہا گیا ہے پھر science سے مربوط مطالب کو ہر قسم کے علم کے لیے استفادہ کیا گیا۔

یہی تمہید جسے بیان کیا گیا ہے اس میں دو علم کے مقامات کو دو مقدموں میں دیکھیں گے یعنی دو قسم کے علم استعمال ہوئے ہیں:

(۴) پہلا مقدمہ جس میں کہا گیا تھا کہ رغبت کو علمی ہونا چاہیے اسکا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس چیز کا معتقد ہونا چاہیے جس پر وہ آگاہی اور معلومات کے ساتھ یقین رکھتا ہو اور یہ اعتقاد تردید اور خواب و خیال کے ساتھ نہ ہو۔ اس مقدمے میں جو علم استعمال ہوا وہی knowledge ہے، جس کے معنی مطلق آگاہی کے ہیں۔ یعنی جب انسان کسی چیز کا معتقد ہو اور اجتماعی، طبیعی، مادی یا فلسفی مسائل میں فیصلہ کرے، تو ضروری ہے کہ مکمل آگاہی کے ساتھ ہو اور تقلید یا وہم پرستی کی بنیاد پر نہ ہو۔ اس تمہید میں یہ علم استعمال ہوا ہے۔

(۵) دوسرے مقدمے میں کہا گیا ہے کہ علم وہ چیز ہے جو تجربہ گاہ میں حاصل ہوتا ہے اس علم سے مراد وہی science ہے۔ یعنی وہ چیز تجربہ گاہ میں اور تجربہ کے قابل ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر چیز تجربے ہی کے ذریعے حاصل کی جائے کچھ معلومات بغیر تجربے کے بھی مل جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ انسان کسی چیز کو واضح اور قاطع آگاہی کے ساتھ حاصل کرے لیکن اسے تجربہ گاہ میں ثابت نہ کر پائے۔ پس اس نے ان دو اقسام کے علوم یعنی knowledge اور science کو پہلے اور دوسرے مقدمہ میں ایک ہی سمجھا اور غلط نتیجہ اخذ کیا۔

ہم کہتے ہیں کہ پہلے مقدمہ کو ہم نے قبول کیا۔ ضروری ہے کہ انسان اس چیز کی طرف رغبت رکھے جو آگاہی کے ساتھ حاصل ہوتی ہے، اس چیز کی جانب نہیں جو وہم و حدس و گمان سے حاصل ہو۔ لیکن دوسرے مقدمے کے بارے میں جس میں کہا جاتا ہے کہ علم و آگاہی

صرف تجربہ گاہ میں حاصل ہوتی ہے' اس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ جی ہاں' خاص تجرباتی علم وہاں سے حاصل ہوتے ہیں' لیکن کیا تمام علوم وہاں سے حاصل ہوتے ہیں؟ ہم اسے قبول نہیں کرتے ہیں۔

حقیقت کونسی ہے؟

اب ہم اس مسئلہ کی طرف واپس پلٹتے ہیں کہ اس نے ایک موضوع کو اپنے لیے یقینی تصور کرلیا اور کہا کہ جو کچھ مادہ ہے یا مادہ کے اثرات میں سے ہے صرف وہی حقیقت reality ہے۔ لیکن جو کچھ مادہ نہیں ہے وہ محض تصور و تخیل اور وہم ہے۔ وہ پہلے اس مسئلے کو ایک اصل کے عنوان سے ہم پر تحمیل کرتے ہیں کہ حقیقت اور واقعیت مادہ ہے پھر کہتے ہیں کہ جو کوئی بھی صرف مادے کا معتقد ہے وہی حقیقت پسند' واقعیت پسند' realist اور واقع بین ہے لیکن جو مادے کے علاوہ بھی کسی اور چیز کو قبول کرتا ہے' کیونکہ وہ چیز حقیقت نہیں ہے پس وہ تخیلاتی' تصوراتی' idealist اور ذہن پرست ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ ہم آپ کے مقدمے کو قبول ہی نہیں کرتے' تحقق و حقیقت واصلیت و تصور و تخیل دراصل ایک گیم کی مانند ہیں کہ ان کا ایک حصہ مادہ اور انرجی ہے' درحقیقت وہ غیر مادی اور مجرد بھی وجود رکھتے ہیں۔ جن میں واقعی تحقق اور خارجی تعین موجود ہے' جو تخیلاتی اور تصوراتی نہیں ہے بلکہ وجود و ہستی کا متن ہے۔ لہٰذا دینی رئیل ازم اور اسلام واقع بین و حقیقت بین تھا اور وہ تحقق پر اعتقاد رکھتا تھا' کہتا ہے کہ خدا اصل تحقق ہے' کائنات عین حق ہے' یعنی وہ لوگ کائنات اور مادے کو بھی واقعیت مانتے ہیں اور غیر مادی حقائق کے لیے بھی تحققِ اصلیت کے قائل ہیں۔

اب ہم یہاں اس بحث کی طرف آئیں گے کہ آپ کس دلیل کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ غیر مادہ اور غیر طبیعت بھی حقیقت اور واقعیت ہیں؟ یہاں ہم ان ہی مباحث پر جا پہنچیں

گے جو وجودِ خدا کے اثبات سے مربوط ہیں۔ یہاں سے ایک بار پھر مسئلہ نظم و مبدأ اور کائنات کے بامقصد ہونے کی جانب پلٹ جائیں گے۔

مسئلہ مبدأ (origin)

مسئلہ مبدأ وہ مسئلہ ہے جس پر ٹھہرنا اور غور وفکر کرنا ضروری ہے۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ جب انسان خدا کو تلاش کرنا چاہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ وجود ہستی کی ابتدا کے بارے میں جستجو کرے اور وہاں خلق کرنے والی ایک طاقت کو حاصل کرے اور اگر اس نقطہ کو حاصل کر لے تو اس نے خدا کو پالیا ہے' لیکن اگر وہ ایسی صورت حال پیدا کر لیں ایسے تفکرات بنا لیں جو کائنات کے لیے نقطۂ آغاز نہ ہوں تو پھر یہ خدا سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

ہم کہتے ہیں اولاً یہ کہ اسلام میں مسئلۂ خدا صرف مبدأ و مُبدِء اور وجود عطا کرنے والا نہیں ہے کہ ہم ہستی کے آغاز کو بحث بنائیں اور دیکھیں کہ ہم وہاں سے ایک خدا برآمد کر سکتے ہیں یا نہیں۔ دراصل وہ ہر روز ایک نئی شان کے ساتھ ہے۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ

وہ ہر روز (بلکہ ہر آن) ایک نئی شان میں ہے۔(۱)

اب یہ کائنات کا تحرک' تبدل' یہ مسلسل ہونا' نہ ہونا' کائنات کے موجودات میں استقلال نہ ہونا اور دائمی تحول یہ سب پوری کائنات کے متنِ ہستی میں ایک لازمی اور وابستگی کی حالت ایجاد کرتے ہیں اور بنیادی طور پر اس میں مسئلہ زمان بیان نہیں ہوا ہے۔ جہاں بھی مادہ موجود ہے یہ اس سے متعلق ہے' کیونکہ مادے میں تحرک ہے اور یہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ کیونکہ ہونے اور تغیر کے قابل ہے' لہٰذا ذات و نہاد و باطن کو تبدیل کر دیتا ہے اور مسلسل تبدیلی کی حالت میں ہے دن نیا تو زمانہ نیا۔ یہ تمام حوادث و موجودات ہمیشہ تسلسل

۱۔ سورۂ رحمٰن ۵۵۔ آیت ۲۹

کی حالت میں ہیں۔ لہٰذا متحرک کائنات نیاز مند و متعلق ہے(۱) بالخصوص ایسی صورت میں کہ جب تحرک کا ایک مقصد ہے اور وہ مسلسل کمال کی سمت گامزن ہے۔

یہ یہودیوں کا عقیدہ اور سوچ ہے جو کہتے ہیں کہ خدا پہلے دن فلاں چیز کو وجود میں لایا' دوسرے دن فلاں چیز کو' تیسرے دن فلاں کو اسی طرح چھ دن تک خلق کرتا رہا اور چھٹے دن کائنات کی خلقت کے کام سے فارغ ہوگیا' ساتویں دن وہ آسمان کے اوپر بیٹھا پھر سیدھا لیٹ گیا اور اپنا دایاں پاؤں بائیں پاؤں پر رکھ کر سکون کی گہری سانس لی اور اس طرح چھ دن کام کے بعد ساتویں دن یعنی ہفتہ کو آرام کا دن وجود میں آیا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہفتہ کے دن تعطیل کی جائے اور آرام کیا جائے اس لیے کہ خدا نے اس دن تعطیل کی ہے۔ یہودی کہنا چاہتے ہیں ساتویں دن خدا کا کام ختم ہوا اور اس نے سکون کا سانس لیا۔

"وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوطَتٰنِ۔"

"یہودی کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے (کچھ نہیں کرسکتا) ان کے ہاتھ بندھیں اور اس (بے ادبانہ) قول کی وجہ سے ان پر لعنت ہو۔ بلکہ اس کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔"(۲)

وہ کہتے ہیں کہ خدا نے بنایا' چلایا پھر اس کے بعد خدا کے ہاتھ بندھے ہیں وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا ہے اور اب کائنات سے اسے کوئی مطلب اور واسطہ نہیں ہے۔ جبکہ اسلامی منطق یہ کہتی ہے کہ جب تک کائنات ہے مشیتِ الٰہی درکار ہے اور نگرانی' سرپرستی' تسلط اور فیضِ الٰہی موجود ہے اور یہ کائنات مسلسل فیضِ الٰہی سے سیراب ہوتی ہے اسکی

۱۔ یہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ کامل تحرک کے لیے ضروری ہے سودمند ہو اور اسے پروان چڑھایا جائے۔

۲۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۶۴

سرپرستی لطفِ الٰہی ہے اور تحرک و دستور العمل دائمی ہے۔ اسکا نظم و ہدف داری ہیشگی ہے۔لہٰذا خدا خواہی و خدا نیازی بھی دائمی ہے۔

حقیقت پردازی کے دعویدار لیکن نظریہ پردازی میں گرفتار

رئیل ازم اور آئیڈیالیزم کے بارے میں جو بحث ہم نے کی ہے میں چاہتا ہوں کہ واپس پلٹ کر ایک نکتہ بیان کردوں۔

انسان دیکھتا ہے کہ یہی لوگ جو خود کو حقیقت پسند شمار کرتے ہیں اور آئیڈیل ازم کو رد کرتے ہیں اور تصور گرائی اور ذہن گرائی کو درست نہیں جانتے ہیں جبکہ یہ لوگ کائنات کی ابتدا کے سلسلے اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے ہمیشہ ہی مفروضہ اور آئیڈیا بنانے کی فکر میں گرفتار رہے ہیں۔ مادہ پرستوں کی کتابوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جب بھی تخلیق کائنات کی مشکل کو حل کرنا چاہتے ہیں ایک ازلی مادے کو تصور کرتے ہیں۔ اور ہم جب خدا کے بارے میں ازلی و ابدی ہونے کے مسئلے کو بیان کرتے ہیں (البتہ خدا کا ازلی و ابدی ہونا' زمان و مکاں سے بالاتر ہونے کے معنی میں ہے) وہ کہتے ہیں کہ ہم یہ تصور نہیں کر سکتے۔ یہ تصور و خیال ہے' لہٰذا قابلِ قبول نہیں جبکہ وہ خود اس مادے کے لیے جس کے اندر تحول و تحرک و تغیر موجود ہے ایک ازلی مادے کے قائل ہوتے ہیں۔

یا کبھی زمین کی پیدائش کے بارے میں کہتے ہیں کہ بادل کی مانند' گیس کی مانند' جمع شدہ ایٹم کے اندر بڑے دھماکے کی بنا پر عظیم کہکشاں کا وجود میں آنا اور پھر کئی سو میلین سال کی فرسودگی کے بعد دوبارہ ایٹم کے ذرات کا بکھر جانا اور بے رنگ صورت میں جمع ہونا اور دوبارہ ان کے اندر ایک دھماکہ وجود میں آنا۔ وہ اس کے بعد پھر کہتے ہیں کہ ہم کیا جانیں؟ کوئی بھی ریاضی' حساب کتاب یا علمی مشاہدہ یا تجرباتی قانون آج تک ان کہکشاؤں کی پیدائش کی وجہ نہیں جان سکا ہے۔

ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ اگر کبھی اسے دریافت کرلیا جائے تو خدا کی نفی ہوجائے گی' مقصد یہ ہے کہ جو یہ کہتے ہیں کہ تصورات کے ذریعے مشکل کو حل نہ کرو' وہ خود مفروضے کے ذریعے مشکل کو کیوں حل کرتے ہیں اور تصور و مفروضے میں گرفتار کیوں ہوجاتے ہیں؟ اور جب بند گلی میں پہنچ جاتے ہیں تو صرف ایک زور و شور کے ساتھ بڑے دھماکوں کی بحث کرتے ہیں لیکن پھر خود ہی اعتراف بھی کرتے ہیں کہ کوئی بھی ایجاد' محاسبہ و مشاہدہ اس عظیم دھماکے کو نہیں دیکھ سکا ہے۔

وجودِ ہستی کی دائمی ضروریات

حتیٰ اگر یہ دریافت انجام پا جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ ہم فرض کریں کہ دنیا اسی طرح ہے: دھماکے کی بنا پر بڑی بڑی کہکشائیں وجود میں آتی ہیں' جو پھر بوسیدہ و پرانی ہو جاتی ہیں پھر دوبارہ وہی مراحل دہرائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم دوبارہ وہی کہیں گے جو خدا نے کہا ہے:

"فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ"

"پس پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔" (۱)

کیسا عجیب نظم ہے یعنی جس طرح ایک بیج کی پیدائش میں یہ تبدیلی' یہ چکر' یہ اتار چڑھاؤ موجود ہے جس سے ایک بیج درخت بنتا ہے اور درخت سے پھول نکلتے ہیں پھر اس پھول سے دوبارہ بیج نکلتے ہیں' کیا حرج ہے کہ پوری کائنات کے اندر بھی یہ گردش اور یہ حرکت ہمیشہ کے لیے موجود ہو؟ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ مادی دنیا کے لیے ایک مرحلے اور ایک دَور کے قائل ہوجائیں؟ چاہے یہ دور اور گردشیں مستقل ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن یہ سب

۱۔ سورۂ یٰسین ۳۶۔ آیت ۸۳

ہم پر ثابت کرتے ہیں کہ پس ایک عجیب نظم بنانے والا موجود ہے۔ پس ایک قدرت منداور طاقتور حکیم طراح (architect) موجود ہے۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر کروڑوں سال قبل خود طبیعت (فطرت) کے اندر ایک حساب موجود ہوسکتا ہے اسکے باوجود یہ ہمیں خدا سے بے نیاز نہیں کرسکتا، ہم انہی دھماکوں اور انہی تحرکات سے بھی خدا کے وجود کی جستجو کرسکتے ہیں۔ لہٰذا ہم صرف آغازِ ہستیٔ جہاں کی تحقیقات کے لیے نہیں بیٹھے ہیں کہ خدا کو تلاش کریں اور اگر کوئی کہے کہ مادہ ازلی ہے تو ہمارے ہاتھ بندھ جائیں اور ہم خدا کو گم کر بیٹھیں۔ ہم جس طرف بھی دیکھتے ہیں، ہر شے کو خدا کی نشانی پاتے ہیں۔ (۱)

”سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ“

”ہم انہیں نشانیاں دکھائیں گے آفاق وکائنات میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی تاکہ ان پر واضح ہوجائے کہ وہ (اللہ) بالکل حق ہے۔“ (۲)

۞۞۞

۱۔ جو قارئین زیادہ تفصیل جاننا چاہیں ان کے لیے بہتر ہے کہ ”آئیڈیل ازم اور رئیل ازم“ کے مباحث کو کتاب ”شناخت اسلام“ میں مطالعہ فرمائیں یہ کتاب شہید باہنر کی تحریر کردہ ہے۔

۲۔ سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۵۳

تیسرا راستہ

انسان محوری

(Humanism)

تیسرا راستہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو منکرِ خدا ہیں اور مادہ کی اصالت کے قائل ہیں اور اسی مادی کائنات پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں ان کے بقول وہ چاہتے ہیں کہ انسان کو عزت عطا کریں اسے حیثیت و مقام سے سرفراز کریں۔ جب ان سے سوال کیا جائے کہ انسان کب عزت و منزلت کے عظیم درجے پر پہنچتا ہے؟ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ جب آزاد ہو جائے، انسان جب ماورائے مادہ و ماورائے ہستی یعنی آسمانی اور الٰہی محکومیت سے آزاد ہو جائے تو اس کے ہاتھ کھل جاتے ہیں اور آزادی کے لیے اس کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے اور وہ شخصیت کا کمال حاصل کر لیتا ہے۔ شاید جدید مغربی ہیومن ازم کی بھی اساس اور بنیاد یہی ہو جن کا دعویٰ ہے کہ ہم انسان کو ہر قسم کی قید و بند سے آزادی دلانا چاہتے ہیں۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ ہر قسم کی جبریت اور محکومیت اور ہر اس چیز کی جو انسان کے دست و پا کو مقید کر دیتی ہے نفی کریں، تب ہی انسان آگے بڑھ سکتا ہے اور اعلیٰ مقامات پر فائز ہو سکتا ہے۔

اگر ہم اس مسئلے کو اسلام کی جہت سے دیکھیں تو بیک وقت یہ تین اہم موضوعات سے مربوط ہے، جن میں سے ایک عدل دوسرا قضا و قدر اور تیسرا انسان کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر ہے۔ قبل اس کے کہ ان مسائل کا اپنے اصل مسئلہ سے ربط و تعلق واضح کریں

ایک مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

یونانی فلسفے کی غلط تفسیر

جدید مغربی ہیومن ازم کیوں اس نتیجے تک پہنچا کہ انسان کو خدا سے جدا کر دیا جائے اور اس کے ارادہ و مشیت سے دور کیا جائے؟

اس مسئلے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ یونانی فلسفے میں انسان کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی غلط تفسیر کی گئی اور یونانی فلسفے کے نظریات مسیحی افکار میں منتقل ہوئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرون وسطی کا فلسفہ اور مسیحی علم کلام میں انسان کے بارے میں جو نظریہ تھا وہ آپس میں مخلوط ہو گیا۔

فلسفہ یونان میں خداؤں کا تصور یہ تھا کہ یہ انسان کے دشمن ہیں اور کبھی بھی نہیں چاہتے کہ انسان ان کے مدمقابل آ کھڑا ہو اور ان سے دست بہ گریباں ہو اسی وجہ سے خداؤں نے آتش مقدس کو انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا لیکن انسان نے چوری چھپے اس آتش مقدس کو ہتھیا لیا اور یوں اس نے معرفت حاصل کر لی اور اپنی الگ حیثیت اور مقام پیدا کر لیا۔ جبکہ ان کے خدا انسان کے عالم ہونے اور عرفان حاصل کرنے سے ڈرتے تھے اس لیے کہ اگر انسان آگاہ ہو گیا اور معرفت حاصل کر لی تو جو کچھ ان خداؤں کے تصرف میں ہے وہ ان کے تصرف میں آجائے گا جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ روئے زمین پر ان خداؤں کا دشمن اور رقیب ان کے مدمقابل آجائے گا۔

یہ لوگ در حقیقت ''رب النوع'' کے قائل ہیں۔ یعنی کائنات کے اندر رونما ہونے والے ہر حادثہ اور ہر تبدیلی کے لیے الگ الگ خدا ہیں، جن کے تحت یہ حادثہ اور تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ پس کائنات کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیاں اور موجود اشیا جیسے انسان، نباتات، دریا، صحرا و دیگر اشیا اور ان سب میں پیدا ہونے والے تغیرات کے لیے الگ الگ

خدا ہیں اور ہر تبدیلی اپنے ہی شعبہ کے خدا کے تحت رونما ہوتی ہے۔

اب اگر انسان عالم ہو گیا اور معرفت حاصل کر لی تو وہ خود اس کائنات پر تصرف کرنے لگے گا جس کے نتیجے میں خداؤں سے دشمنی جنم لے گی اور عدم اطاعت اور سرپیچی ظاہر ہو گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان انسانوں کا راستہ روکا جائے اور انہیں علم وعرفان سے دور رکھا جائے تاکہ یہ کائنات پر اپنا تسلط قائم نہ کر سکیں۔ یہ مسئلہ فلسفہ وکلام کے لحاظ سے بھی اور تاریخِ فلسفہ کی جہت سے بھی قابلِ مطالعہ ہے تاکہ سمجھا جا سکے کہ یونان اور قدیم یورپی فلسفہ میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کا خدا سے رابطہ کیسے ہے؟

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مسیحیت، یہودیت اور کتبِ عہدین (عہدِ عتیق اور عہدِ جدید) مکمل طور پر روم اور یونان کے طرزِ تفکر، فلسفہ، آداب، حقوق اور قوانین کی آمیزش سے محفوظ نہ رہ سکیں جس کے نتیجے میں ہی مسیحی علمِ کلام اور فلسفہ پروان چڑھا۔

کتبِ عہدین میں داستانِ آدم

آپ دیکھتے ہیں کہ کتبِ عہدین میں حضرت آدمؑ کی داستان جس انداز میں بیان ہوئی ہے، قرآن نے اسے بالکل برعکس بیان کیا ہے۔ کتبِ عہدین میں شجرِ ممنوعہ سے مراد شجر معرفت ہے۔ یعنی خدا نہیں چاہتا کہ انسان معرفت حاصل کرے۔ خدا انسان کے آگاہ ہونے اور معرفت حاصل کرنے سے ڈرتا ہے اور حسد رکھتا ہے اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے مقابلے میں روئے زمین پر ایک نئی قدرت پیدا ہو جائے جو اس کے مدِ مقابل اور دشمن ہو۔

کتبِ عہدین میں یہ کہا گیا ہے کہ آدمؑ نے معصیت کی شجرِ معرفت کو کھا لیا جس کی وجہ سے انہوں نے آگاہی حاصل کر لی۔ پھر جب اچانک متوجہ ہوئے تو دیکھا برہنہ ہیں تو فوری طور پر درخت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانپا اسی کے ساتھ ہی درخت کے نیچے

سے خدا کی آواز کو سنا جو کہہ رہی تھی کہ: اے آدم! کیا تم نے اس درخت سے کھالیا ہے جب کہ میں نے تمہیں اس کے کھانے کو منع کیا تھا؟ اب تم نے معرفت حاصل کر لی ہے اور اپنی حالت سے آگاہ ہو گئے ہو۔ پھر انسان اسی گناہ کی وجہ سے قابلِ مذمت و نفرت' ابدی گناہ میں گرفتار اور راندۂ درگاہِ الٰہی ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے قابلِ نفرت قرار پایا اور لعن طعن کا مستحق ٹھہرا۔ طوفان نوحؑ بھی خدا کے اسی غضب کا نتیجہ ہے۔ بالآخر حضرت مسیحؑ پیدا ہوئے انہوں نے انسان کو اس ابدی ذلت اور گناہ سے نجات کی خاطر الٰہی روح اس کے اندر پھونک دی اور یوں یہ روحِ الٰہی کا مجسمہ بن گیا۔ لیکن روحِ الٰہی فقط عیسیٰؑ کے بدن' کلیسا اور مذہبی راہنما جو ان کے جانشین ہیں کی صورت میں ہی تجلی کرتی ہے اور دوسرے بدن اس روحِ الٰہی سے خالی ہیں اور گناہ گار اور قابلِ نفرت ہیں اور وہ فقط کلیسا کی محبت اور عنایات اور مذہبی راہنماؤں اور رہبروں سے ربط و تعلق ہی کی وجہ سے اس ابدی اور ذلت آمیز گناہ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔

اس طرح روحانیت کلیسا میں منتقل ہو گئی اور اسی دستر خوان سے اپنا پیٹ بھرا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے اس نفرت' بغض اور لعنت سے نجات حاصل کرنے کے لیے مذہبی پیشواؤں اور کلیسا کے دامن میں پناہ لی۔ یہی وجہ بنی کہ قرونِ وسطیٰ میں مسیحیت نے بالادستی حاصل کی اور مرکز و محور قرار پائی۔ یہی بات جدید مغربی ہیومن ازم (انسانی دوستی) کے وجود میں آنے کا باعث بنی۔ ہیومن ازم نے اس انداز کی الٰہی فکر جو کلیسا میں پروان چڑھ رہی تھی اور ترویج پا رہی تھی کو اپنے پاؤں تلے روندا اور اس کلیسائی انسان کے مد مقابل انسان دوستی اور انسان محوری کے نظریہ کو میدان عمل میں لائے اور کہا کہ ابھی تک محور خدا تھا اور اب محور و مرکز انسان ہے۔ ابھی تک ہم نے دیکھا کہ کلیسا سے کیا چیز اور کون سی فکر آتی ہے اور وہ کیسے ہدایت و رہنمائی کرتے ہیں اور راہِ نجات کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن اب ہم انسان کو اس جبر سے آزاد کرتے ہیں اور انسان محور بنتے ہیں اور ہر چیز اس

انسان کے گرد طواف کرے گی۔

اسی مسئلے اور فکر ہی کی وجہ سے ہیومن ازم مسلسل آگے بڑھتی رہی اور یوں انسان دوستی کا نیا انداز اور اس کے بارے میں نئی فکر نے جنم لیا جس میں غیر از انسان ہر چیز جو انسان کو الہام دے سکتی ہے جیسے قوانین' آداب' اصول وضوابط' اقدار' اخلاقی مسائل اور اس سے بڑھ کر وحی اور الٰہی مسائل سب کی نفی کی جاتی ہے۔ اس فلسفہ وفکر کی بنیاد پر سب کچھ انسانی ارادہ ومشیت ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں جس سے یہ الہام لے۔ یہ فلسفہ نہ صرف خدا کی نفی کرتا ہے بلکہ اقدار اور اصول وقوانین کا بھی منکر ہے (۱) کیونکہ اگر یہ اقدار اور قوانین موجود رہیں تو انسان مجبور ہے کہ ان کی اتباع کرے اور ان کا اسیر ہو جائے اور اس کوشش میں لگا رہے کہ ان کو حاصل کرے۔

مثال کے طور پر کچھ لوگ عدل وانصاف کو ایک اخلاقی قدر کے طور پر جانتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے نمونہ موجود ہو اور لائحہ عمل ہو جس کے تحت یہ اس اخلاقی قدر کو اپنا سکے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غیر از انسان کوئی چیز ایسی ہے جس کے گرد انسان گردش کرے اور اس کو اپنا محور بنائے۔ جبکہ ان کے نزدیک انسان ہی محور ومرکز ہے اور اس کے علاوہ اور کسی چیز کا کوئی وجود نہیں۔ پھر جب ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص صحیح راستے کا انتخاب کرنا چاہے اور سعادت مند زندگی گزارنے کا خواہاں ہو تو وہ کیا کرے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اچھی اور درست راہ انسان اپنے ارادہ خلّاق اور اپنی آزادی ہی سے وجود میں لاتا ہے اور اس کا انتخاب کرتا ہے اور جس کو وہ منتخب کرے اور جس کی وہ خود تشخیص کرے وہی بھلائی ہے وہی سعادت وخوش بختی ہے۔ پس ماہیتِ انسان پہلے سے نہیں ہے بلکہ خود

۱۔ البتہ اقدار اور اخلاقی اقدار کی نفی وہ مسئلہ ہے جو مختلف فلسفوں جیسے مادیت اور مادہ پرستی (materialism) سے لیے گئے ہیں یہ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے اس تک پہنچتے ہیں۔

انسان اپنی ماہیت وحقیقت کو بناتا ہے اور کوئی اور معیار اور قانون ایسا نہیں جس کی بنا پر وہ اپنی ماہیت تشکیل دے بلکہ وہ خود اپنی سعی وکوشش سے ہی اسے تشکیل دیتا ہے۔

یہ فلسفہ فقط ملحدانہ ہی نہیں بلکہ بعض افراد جو کہ خدا پرست بھی ہیں اس فلسفہ پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نظریہ خدا پرستی سے متعارض نہیں ہے اور کہتے بھی ہیں کہ انسان کے علاوہ کوئی اور قانون معیار اور قدر نہیں بلکہ خود انسان ہی ان اصولوں اور قواعد کو بناتا ہے اور خدا پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

آزادی کی ابتدا

اب ہم اُن (humanist) کا یہ نظریہ کہ انسان آزاد ہے کا تجزیہ وتحلیل کرتے ہیں۔ کہ انسان نے یہ آزادی کہاں سے لی؟ وہ کہتے ہیں کہ یہ آزادی اسے دے دی گئی ہے یا بقول سارتر انسان مجبور ہے کہ آزاد ہو۔ اور یہ آزادی لعنت کا ایسا پھندا ہے جو اس انسان کی گردن میں ڈال دیا گیا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ یہ طوق جو اس کی گردن میں ڈال دیا گیا ہے وہ کہاں سے آیا ہے؟ یہ طوق کس نے ڈالا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا لیکن جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے آزادی کے ساتھ آیا ہے۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ یہ آزادی وہ خود اپنے پاس سے تو نہیں لایا پھر کہاں سے آئی؟ وہ جواباً یوں کہتے ہیں کہ انسان مجبور ہے کہ آزاد ہو اور آزادی کے ساتھ رہے، اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جبر کہاں سے آیا ہے؟ اگر تم کہو کہ فطری طریقے سے حاصل ہوئی ہے۔ تو ہم جب کہتے ہیں کہ یہ آزادی انسان نے خدا سے لی ہے۔ تو تم کہتے ہو کہ انسان آزاد ہے اور آزادی اس کے ساتھ ہے اور یہ کہ وہ آزادی اپنے پاس سے بھی نہیں لایا تو پھر ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ انسان آزاد ہے اور آزادی اس کے ساتھ ہے اور یہ آزادی اپنے پاس سے بھی نہیں لایا بلکہ جو اس کائنات کی تخلیق کرتا ہے اور جو اس کے نظام کو چلا رہا ہے اسی خالق اور مدبر نے انسان کو آزاد خلق کیا ہے۔

انسانی آزادی اور ارادۂ الٰہی کا باہمی ارتباط

کیا مشیتِ الٰہی کی بنا پر انسان مجبور ہے۔ کیا انسان کی تقدیر کے بارے میں علمِ خدا کا نتیجہ جبریت اور محکومیت ہے؟ یہی وہ جگہ ہے جہاں دوحساس اور دقیق ابحاث مسئلہ قضاو قدر اور مسئلہ جبرو اختیار زیرِ بحث آتے ہیں۔ البتہ ہم یہاں پر انتہائی اختصار کے ساتھ ان مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے اولاً: کہ کائنات کے حوادث اور ہر تبدیلی قوانین کے تحت ہوتی ہے' اور ثانیاً: انسان بھی کائنات کا ایک حصہ ہے یہ بھی دیگر اشیا کی طرح قوانین اور اصولوں کے تابع ہے اور ان قوانین میں سے ایک قانون جو انسانی زندگی پر کارفرما ہے وہ آزادی ہے جسے خالق کائنات نے اسے مرحمت فرمایا ہے۔ چند شرائط کے تحت ہی انسان اپنی راہ متعین کرتا ہے اور انہی کے تناظر میں انسان ارادۂ خلاّق رکھتا ہے اور آزاد ہے ان شرائط میں معاشرے کا ماحول' جغرافیائی حالات' وراثتی خصوصیات' ذاتی صلاحیتیں اور تربیتی عوامل' اجتماعی قواعد وضوابط وغیرہ ہیں' جن کے تحت راہ کا انتخاب ہوتا ہے اور انسان کی آزادی کا تصور ممکن ہوتا ہے۔

اس ضمن میں بہت سی قرآنی آیات موجود ہیں جو کہتی ہیں کہ خدا ہی ہے جو گمراہ کرتا ہے' خدا ہی ہے جو عزت دیتا ہے' وہی ہے جو ذلت دیتا ہے' وہی ہے جو روزی عطا کرتا ہے۔ کیا یہ آیات انسان کے مجبور ہونے پر دلالت کرتی ہیں؟ یعنی کیا انسان کی ساخت سورج' چاند' نظام شمسی' کہکشاں اور دیگر اشیا' پودے وغیرہ جیسی ہے کہ جن کے لیے جو راہ متعین ہے وہ اسی راہ پر گامزن ہیں جیسے کہ ایک پودا مجبور ہے کہ اسی اصول کے تحت پروان چڑھے جو اس کے لیے متعین ہے۔ اسی طرح جیسے گلِ یاسمین کا پودا گلاب کا پھول نہیں دے سکتا۔ یہ سب اشیا اس معین راہ پر گامزن ہیں جو ان کے لیے معین کردی گئی ہے۔ وہ آزادی سے اپنی شاخوں کو

اِدھر اُدھر حرکت نہیں دے سکتے اور نہ ہی وہ اپنی بو یا رنگ تبدیل کرنے میں آزاد ہیں۔

ایک سورج یا وہ سیارے جو اس کے گرد محوِ گردش ہیں ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اپنی رفتار' اپنے محور' اپنے فاصلے اپنی کرنوں یا اپنی گردش میں تبدیلی لا سکیں۔ سب اشیا مشیتِ ایزدی کے سامنے مجبور ہیں کہ جو راہ ان کے لیے متعین ہے وہ اسی پر چلیں۔

انسان بھی مشیتِ الٰہی کے سامنے مجبور ہے مگر سوال یہ ہے کہ جبر انسان کے حوالے سے کیسا ہے؟ یعنی یہ کہ انسان اپنی راہ کے انتخاب' اس کی تشخیص' اس کے بارے میں علم و آگاہی اور مصمّم ارادہ کرنے میں آزاد ہے' چاہے تو وہ چاہِ مذلت میں گر جائے اور چاہے تو سعادت و خوشبختی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ پس جو قانون انسان کے لیے ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان آزاد ہو انتخابِ راہ میں بااختیار ہو۔

"فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ..."

"اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے"(۱)

"اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا"

"یقیناً ہم نے اسے راستہ (حق و باطل) کی ہدایت دے دی ہے چاہے وہ شکر گزار ہو جائے یا کفرانِ نعمت کرنے والا ہو جائے"(۲)

"اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا"

"بیشک ہم نے امانت کو آسمان' زمین اور پہاڑ سب کے سامنے پیش کیا اور

۱۔ سورۂ کہف ۱۸۔ آیت ۲۹

۲۔ سورۂ الانسان ۷۶۔ آیت ۳

سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور خوف ظاہر کیا بس انسان نے اس بوجھ کو اٹھالیا کہ انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے"(۱)

وہ امانت جسے انسان نے اٹھالیا شاید وہ یہی اختیار اور آزادی وارادہ تھا اور اسی گراں بہا قیمتی گوہر ہی کی وجہ سے انسان اس قابل ہو سکا کہ انسان خود انتخاب کرے اور عزم وارادہ کرے۔

کیسے قضاوقدر ہمارے ارادے اور آزادی کی راہ پر اتنی سایہ فگن ہے کہ ہمارا بولنا' ہمارا نگاہ کرنا' ہماری آمد و رفت حتیٰ کہ ہماری پوری زندگی اس کے ارادے کے احاطے میں ہے اس کی وضاحت کے لیے دو مثالیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

فرض کریں ایک سیب کا درخت ہے پروردگارِ عالم نے اس درخت کے لیے کچھ قوانین مقرر فرمائے ہیں جن کے تحت اس درخت کے اوپر شاخیں نکلتی ہیں ان شاخوں پر پتے اور شگوفے نکلتے ہیں اور بالآخر سیب کا پھل حاصل ہوتا ہے۔ اب آپ نے اس درخت پر ناشپاتی کا پیوند کیا ہے۔ اور اس پیوند سے ناشپاتی کا پودا نکل آیا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ یہاں پر مشیت ایزدی کے سوا کچھ ہے؟ کس نے اس ناشپاتی کے پودے کو خلق کیا ہے؟ کون ہے کس نے اس قلم (جو پیوند کے طور پر لگائی گئی تھی) سے شگوفہ نکالا؟ وہ خدا ہی ہے جس نے اس پودے کی تخلیق کی ہے۔ جب ہم نے اس سیب کے درخت پر ناشپاتی کی قلم پیوند کاری کے طور پر نہیں لگائی تو اس درخت سے سیب کا پھل حاصل ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ کس نے سیب کو خلق فرمایا؟ اسی طرح کیسے ممکن ہوا کہ سیب ناشپاتی بن گئی؟ یہاں پر ایک آزاد اور با اختیار ہاتھ نے اپنی آزادی سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے اختیار کے ساتھ جو خدا نے اسے دیا تھا اسی قانون کے تحت جو کائنات پر حاکم ہے اور اسی قضاوقدر کے

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۷۲

تحت اور اسی فارمولے کے مطابق' جو اس کے لیے متعین ہوا ہے اور اسی علت اور انہی عوامل کے تحت جو دنیائے علل کے تحت ہیں' ہوا ہے۔ تو یہاں پر بھی مشیتِ الٰہی اور قضا و قدرِ پروردگار ہے: اے انسان تم آزاد ہو اور ان علل و عوامل کو تبدیل کر ڈالو لیکن تم جہاں کہیں بھی ان علل و عوامل کو لے جاؤ گے ہر جگہ قدرت اور ارادۂ خدا موجود ہے۔

اب ہم واپس پلٹیں گے تاریخ اور اجتماعی سنتوں کی طرف۔

تاریخی جبر پر اعتقاد

وہ افراد جو اس بات کے قائل ہیں کہ ہر قسم کا تغیر و تبدل تاریخ کی ایک بے ثمر حرکت کا نتیجہ ہے اور یہ تاریخ مختلف ادوار پر مشتمل ہے۔ اور ہر واقعے کے اندر اور ہر مرحلے کے اندر اس کی ضد پروان چڑھتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ان واقعات اور انکی اضداد کے درمیان سے ایک نیا واقعہ اور مرحلہ رونما ہوتا ہے۔ (اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے)۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ تاریخ مجبور ہے اور بغیر کسی چوں چرا کے حتمی و قطعی طور پر آگے بڑھے اور اپنا سفر جاری رکھے۔ غرض ہر نظام کے بعد ایک نیا نظام اور ہر تاریخی مرحلے کے بعد ایک نیا مرحلہ اور ہر اندازِ زندگی کے بعد ایک نیا طرزِ حیات اور اسی طرح ہر صنعتی و اقتصادی تدم کے بعد ایک نیا ربط و تعلق ہو؟

ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اس تاریخی حرکت اور سفر کے اندر انسان کا کردار کیا ہے؟ آپ کی بات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بیچارہ انسان تاریخ کی حرکت کے ہاتھوں مجبور اور محکوم ہے۔

اس سوال کے جواب میں یہ (humanist) کہتے ہیں کہ اس تاریخی حرکت میں انسان کا کردار یہ ہے کہ وہ تاریخ کی اس تکاملی حرکت کو تیز تر کرے۔ تاریخ اپنا سفر جاری رکھتی ہے لیکن انسان کا کردار یہ ہے کہ وہ اس میں سرعت لائے یا تضادات ایجاد کر کے

تبدیلی کے عمل میں تیزی لائے اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ سنتِ تاریخ ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر انسان تاریخ کی اس حرکت اور سفر کے ساتھ حرکت نہ کرنا چاہے تو ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ بس آپ کا فلسفہ تو عقیدۂ خدا کے مدمقابل تھا پھر کیا ہوا کہ انسان پھر تاریخ کے چکروں میں جا پھنسا ہے اگر ہم اس پوری بات کی اچھی طرح تحلیل کریں تو انسان کی آزادی، ارادہ اور اختیار کا بہت کم عمل دخل رہ جاتا ہے۔

اسلام کی نگاہ

اسلام کہتا ہے: اے انسان تو گردشِ زمانہ میں تبدیلی لا سکتا ہے۔ تو نہ صرف اس کی رفتار میں تیزی لا سکتا ہے بلکہ اگر تو چاہے تو کوئی نئی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے البتہ تم جو بھی تبدیلی لاؤ گے جس طرح بھی حرکت پیدا کرلو پھر بھی وہ الٰہی قوانین کے تحت ہی ہوگی اور سنتِ الٰہی ہی ہوگی۔

اسلام میں فلسفۂ تاریخ اور الٰہی قوانین (سنتِ الٰہی) کی بحث بڑی بنیادی اور حساس ہے۔ اور ہم یہ دعویٰ نہیں کر رہے کہ ہم نے اس حوالے سے اسلام کے نقطۂ نظر کو مکمل طور پر سمجھ لیا ہے۔ البتہ قرآن کی بعض آیات اس ضمن میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں جن کا مطالعہ انتہائی دلچسپ ہے۔ قرآن تاریخ (زمانہ) کے لیے بھی اسی طرح قوانین کا قائل ہے جس طرح کائنات کے پورے نظام کے لیے قائل ہے کہ وہ قوانین کے تحت چل رہا ہے یعنی کائنات میں رونما ہونے والا ہر تغیر اور وجود میں آنے والا ہر حادثہ علل وعوامل کے تحت اور حساب کتاب اور نظم وضبط کے تحت ہے۔ اسی طرح تاریخِ بشر میں رونما ہونے والی ہر تبدیلی اور اقوام وملل کے عروج وزوال میں سے ہر ایک عمل بغیر قوانین کے نہیں ہے بلکہ ہر عمل قانون کے مطابق انجام پاتا ہے۔ جیسے آیت قرآن میں اس طرف اشارہ ہوا ہے:

"فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا"

''اب یہ ان کے گھر ہیں جو ظلم کی بناء پر خالی پڑے ہوئے ہیں۔''(۱)

اصول تاریخ اور زمانے کا قانون ظلم و ستم کی بنیادوں کو متزلزل کرنا اور منہدم کر دینا ہے اس طرح کے قوانین قرآنِ مجید میں کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن ابھی ہم اس سے بحث نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی ہمارے موضوع سخن سے مربوط ہے۔ ہم فقط اس بحث کو اپنی اصل بحث سے مربوط کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کے نزدیک تاریخ کے جو قوانین ہیں (۲) ان میں انسان کی ذمہ داری کیا بنتی ہے؟ یہی کہ جو دیگر کائناتی اشیا کی ذمہ داری ہے طبیعی قوانین پر چلنے کی جو ذمہ داری ہے۔

میں چاہوں یا نہ چاہوں طوفان آئیں گے، زلزلے آئیں گے، سیلاب آئیں گے، گرمیوں میں گرمی پڑے گی، سردیوں میں درجۂ حرارت صفر سے نیچے چلا جائے گا۔ یہ سارے طبیعی عوامل اور قوانین موجود ہیں جنہیں ہم بدل نہیں سکتے۔ لیکن اب ان طبیعی عوامل اور قوانین کے ہوتے ہوئے ہم انسانوں کی کیا ذمہ داری ہے؟ اسلام کے انسان کی ان قوانین کے اندر رہتے ہوئے ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان کو تسخیر کرنے کی کوشش کرے۔ طوفان کے قانون کے مقابلے میں ایک دوسرے قانون سے استفادہ کرے تاکہ اس سے محفوظ و مامون ہو جائے۔ زلزلے کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے ایک دوسرے قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی عمارتیں بنائی جائیں کہ جو زلزلے کے بے رحم ہاتھوں کی نظر نہ ہوں۔ دریاؤں کے رُخ بدل دیئے جائیں تاکہ وہ آبادیوں کو تباہ و برباد نہ کر سکیں۔ کائنات کے اندر ایک طبیعی قانون یہ ہے کہ پانی بلندی سے نیچے کی طرف آتا ہے۔ اب ایسی ٹیکنالوجی سے استفادہ کیا جائے کہ اس کو کنٹرول کر کے مناسب راستہ اختیار کرنے پر

۱۔ سورۂ نمل ۲۷۔ آیت ۵۲

۲۔ ابھی تک ہم نے اس بارے میں بحث نہیں کی ہے نہ ہی جانتے ہیں کہ کیا ہیں۔

مجبور کیا جائے۔

اے انسان تو ان فصلوں سے زیادہ مقدار میں پھل حاصل کرنے، کھیتوں کو جلد آباد کرنے، ایک سال میں دو دو بار فصل حاصل کرنے، زیادہ پھل حاصل کرنے اور زیادہ بہتر اور لذت بخش پھل حاصل کرنے کے لیے مؤثر ذرائع استعمال کر سکتا ہے اور مختلف طریقے استعمال کر کے اچھی اور من پسند فصل حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اے انسان تو جتنی بھی سعی و کوشش کر لے پھر بھی قوانین اور طبعی عوامل کے دائرہ کار سے نہیں نکل سکتا۔ یعنی اگر تم اسپرے کر لو اور اسی طرح پانی کو جس انداز میں بھی استعمال کر لو اور دیگر ذرائع استعمال کر لو پھر بھی تم نے ان ہی قوانین سے استفادہ کرنا ہے جن کے تحت فصل جلدی اور اچھی ہوتی ہے۔ اے انسان تم درحقیقت اپنی خلاقیت والی قوت اور اپنے ارادہ واختیار ہی سے جو خدا نے تمہیں عطا کیا ہے الٰہی قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہو۔

تلاش و کوشش کے ساتھ دعا

پروردگارِ عالم نے اقوام وملل کے لیے عزت کے کچھ قوانین مقرر فرمائے ہیں اور اس نے کبھی بھی عزت، سرفرازی اور کامیابی کسی بھی قوم وملت کو بغیر کسی قانون کے نہیں دی۔ ان لوگوں کی خام خیالی ہے کہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف دعا کرنے سے کوئی ملت عزت وعظمت حاصل کرتی ہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ آپ کو چاہیے کہ سیرت پیغمبرؐ کا ہی مطالعہ کر لیں کہ جب دشمن کی طرف سے حملے کا خطرہ سروں پر منڈلا رہا ہوتا تھا تو بقول امیر المومنینؑ دشمن کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی جاتی، لشکر تیار ہوتا، صف بندی کی جاتی، میدان کارزار میں لشکر کو منظم کیا جاتا اور اس کے دیگر پہلوؤں کے بارے میں سوچ بچار ہوتی اور جب لشکر حملے کے لیے مکمل آمادہ ہو جاتا تو پھر آپؐ دست دعا ہاتھ بلند فرماتے اور خدا سے فتح وکامیابی کی التجا کرتے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ رب العزت ہے۔

"وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۔ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔"

"اور بہت سے ایسے نبی گزر چکے ہیں جن کے ساتھ بہت سے اللہ والوں نے اس شان سے جہاد کیا ہے کہ راہِ خدا میں پڑنے والی مصیبتوں سے نہ کمزور ہوئے اور نہ بزدلی کا اظہار کیا اور نہ دشمن کے سامنے ذلت کا مظاہرہ کیا اور اللہ صبر کرنے والوں ہی کو دوست رکھتا ہے۔ ان کا قول صرف یہی تھا کہ خدایا ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ ہمارے امور میں زیادتیوں کو معاف فرما۔ ہمارے قدموں کو ثبات عطا فرما اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔" (۱)

بزدلی، کمزوری، ذلت وخواری اور سستی وکاہلی چھوڑ دی اور اپنی تمام تر قوتیں مجتمع کرلیں اور پھر کہا: "ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ" "ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما" فتح وکامرانی بھی قواعد وضوابط کے تحت ہوتی ہیں۔

کامیابی ایسے ہی میسر نہیں آتی، علم کا حصول بھی محنت وکوشش سے ممکن ہے بغیر کسی سعی وکوشش اور قانون کے علم نہیں آتا اگرچہ کوئی شخص اس انتظار میں ہی کیوں نہ ہو کہ رات سوئے گا اور صبح علمِ لدنی سے بہرہ ور ہو جائے گا، اسکا سینہ علوم ومعارف کا خزانہ بن جائے گا

ا۔ سورہ آل عمران ۳۔ آیات ۱۴۶، ۱۴۷

عالم بننے کے لیے بھی درس پڑھنا ضروری ہے، زحمت کرنی پڑتی ہے تب جا کر کوئی شخص عالم بنتا ہے۔ اسی طرح دیگر اجتماعی امور بھی محنت شاقہ اور سعیٔ بلیغ سے ممکن ہیں۔ اس آیت "تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ" (۱) کے ساتھ ساتھ ان آیات پر بھی توجہ دی جائے۔

"وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ" (۲)

"كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ" (۳)

"إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ" (۴)

اس طرح کی بہت سی آیات قرآن میں موجود ہیں جو بشر کی زندگی پر حاکم قوانین کو بیان کرتی ہے اور اجتماعی زندگی کے حوالے سے ان قوانین کو بیان کرتی ہیں جن کے تحت کوئی معاشرہ یا قوم وملت عزت وذلت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ جو شخص محنت وکوشش کیے بغیر پھل حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی یہ خواہش مشیتِ ایزدی کے بالکل خلاف ہے۔ اسی طرح جو کچھ کیے بغیر فتح وکامرانی کا پرچم لہرانا چاہتا ہے وہ ان قوانین کے ہوتے ہوئے جن کے تحت ہی کامیابی ممکن ہے کبھی بھی فتح کی دہلیز پر قدم نہیں رکھ سکتا۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا پر عقیدہ رکھنے کا مطلب سستی وکاہلی اور میدان کو خالی چھوڑ دینا ہے جب کہ اسلام کہتا ہے کہ خدا پر یقین وایمان کا مطلب قانونِ الٰہی کے تحت

۱۔ جس کو چاہتا ہے اقتدار دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے (اقتدار) سلب کر لیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۲۶

۲۔ اور انسان کے لیے صرف اتنا ہی ہے جتنی اس نے کوشش کی ہے۔ سورۂ نجم ۵۳۔ آیت ۳۹

۳۔ ہر نفس اپنے اعمال میں گرفتار ہے۔ سورۂ مدثر ۷۴۔ آیت ۳۸

۴۔ اور خدا کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے کو تبدیل نہ کر لے۔ سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۱۱

کاموں کو انجام دینا ان سے استمداد کرنا اور ہر قسم کی سستی کا مطلب ان قوانین کی مخالفت اور تخلّف کرنا ہے۔ اگر آپ فصلوں پر اسپرے نہیں کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بیماریاں پودوں کی رگ و پے میں سرایت کر جائیں گی، پھل خراب ہو جائیں گے، پودے بیماریوں کی نظر ہو کر گل سڑ جائیں گے اور ملیا میٹ ہو جائیں گے۔ ان بیماریوں کو ختم کرنے کے لیے بھی ایک قانونِ الٰہی تھا جس سے استفادہ نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری کی پوری فصل ہی خراب ہو گئی۔ اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ پورا معاشرہ برائیوں کی لپیٹ میں آجائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ دفع آفات ضروری ہیں یا نہیں؟ کیا دفع آفات کے لیے اقدامات کرنا مشیتِ الٰہی کے خلاف ہے یا مشیتِ الٰہی ہی کے تحت ایک قانون سے نکل کر دوسرے قانون میں جانا ہے؟

قضائے الٰہی کے تحت حرکت

ایک مشہور روایت جس کی نسبت حضرت علیؑ کی طرف دی جاتی ہے کہ مولاؑ ایک خستہ حال دیوار کے نیچے بیٹھے تھے اور متوجہ ہوئے کہ دیوار گرنے والی ہے مولاؑ وہاں سے اٹھے اور دوسری جگہ جا بیٹھے۔ ایک ماننے والے نے جو روحِ اسلام نہیں سمجھتا تھا حضرت علیؑ سے خطاب کرتے ہوئے کہا "اتفرّ من قضاءِ اللہ" کیا آپ قضاء الٰہی سے فرار کرنا چاہتے ہیں؟۔ دراصل وہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر آپ کی قسمت میں مرنا لکھا ہے تو چاہے اس دیوار کے نیچے بیٹھیں یا نہ بیٹھیں موت آئے گی اور قسمت میں یہ لکھا ہے کہ زندہ رہنا ہے تو چاہے اس جگہ پر رہیں یا اُس جگہ پر زندہ ہی رہیں گے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا: آفرّ من قضاء اللہ الی قدر اللہ۔ میں قضاءِ خدا سے قدرِ خدا کی طرف فرار کر رہا ہوں۔ یعنی یہاں بیٹھنا ایک قانون ہے اور یہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھنا دوسرا قانون ہے اور یہ دونوں ہی قوانینِ خدا ہیں۔ یہاں پر بیٹھنے کا مطلب موت یا

کم از کم زخمی ہونا ہے اور یہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھنا امن و سلامتی اور زندگی ہے۔ اور دونوں ہی قانونِ الٰہی ہیں۔ البتہ مجھ پر واجب نہیں کہ میں اسی قضا اور قانون کے تحت ہی رہوں بلکہ میں اس قانون اور اس قضا سے نکل کر دوسرے قانون اور دوسری قضا کی طرف جا سکتا ہوں۔

میں ایسا راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہوں جس کا نتیجہ ذلت و خواری' جہالت اور غلامی ہو میں دوسرا راستہ اختیار کر رہا ہوں جس کی انتہا عزت و سرفرازی' آزادی و علم و حکمت پر ہے۔ ہم مشیتِ الٰہی کے تحت ہی زندگی گزارتے ہیں جس راستے کو بھی اختیار کر لیں بالآخر مشیتِ الٰہی ہی کے دائرہ کار میں ہوں گے۔ ارادے کی یہ آزادی اور اختیار خدا ہی نے دیا ہے چاہے تو ہم اس راہ پر گامزن ہوں یا اس راستے پر چل نکلیں۔ البتہ یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم جس راہ کا بھی انتخاب کریں آفات کی بھیانک وادی میں جا گریں گے یا اس راہ کے فوائد سے ہمکنار ہوں گے۔ ان تمام راستوں میں سے ہر ایک راستے کی کچھ خصوصیات ہیں' کچھ شرائط ہیں لیکن اے انسان تو آزاد ہے اور ان راستوں پر لگے ہوئے نشانات کی مدد سے تجھے انتخاب کرنے کا اختیار ہے۔

شخصیت کی حقیقت اور انسان کی عظمت

اب پھر اپنے موضوع بحث کی طرف پلٹتے ہیں کہ کیا انسان اس وقت عزت و عظمت حاصل کرتا ہے کہ جب اسے یک و تنہا بحرِ ظلمت میں چھوڑ دیا جائے' جس میں کوئی امید کی کرن موجود نہ ہو' کوئی ہدایت و راہنمائی کی علامت نہ ہو' تنہا بے سہارا' مضطرب و پریشان حال مایوسیوں کے دریا میں غرق' اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور پھر کہا جائے کہ اب تو اپنا راستہ منتخب کر' خود عزم و ارادہ کر اور خود ہی راہ تلاش کر' وغیرہ وغیرہ؟ کیا یہ بہتر ہے یا یہ کہ انسان کی آزادی اپنی جگہ محفوظ لیکن اس کی راہنمائی کے لیے مختلف جگہوں پر اشارے'

علامات وغیرہ لگا دی جائیں؟

یہ کائنات اندھی بہری اور گونگی نہیں ہے' دنیا بولنے والی اور روشن و درخشاں و گویا ہے' بیدار و ہوشیار ہے۔ اور تم اے انسان اس وسیع جہاں میں جو قوانین اور معیارات کے تحت ہے خوب غور و فکر کرو اور سمجھو پھر صحیح راستے کا انتخاب کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ طریقہ بہتر ہے یا یہ کہا جائے کہ غیر از انسان کوئی چیز موجود نہیں' اے انسان تو ہی ہے اور تو ہی تمہاراہ کی تخلیق کر؟

اقدار کو رد کرنے کا پس منظر

جی ہاں اگر اصولوں کو انسان پر لاد دیا جائے اور اسے غلط وعدوں و تبلیغات اور گمراہی کے ساتھ فریب دیا جائے اور اس طرح کا ماحول بنا دیا جائے کہ جب وہ آنکھ کھولے تو اسے پتا چلے کہ وہ جال میں پھنس چکا ہے' یہ رد شدہ ہے۔ شاید بعض لوگ جنہوں نے ان فلسفوں کو اختیار کیا انہوں نے ماحول کے اندر اس حد تک فریب دیکھا' اور آزادی کی صورت میں اس قدر غلامی دیکھی' حریت کے نام پر اس قدر لاابالی پن اور دلوں پر زنجیریں پڑی دیکھیں کہ کہنے لگے اگر ہم چاہیں کہ ان زبردستی کے اصولوں پر اور دیئے گئے دروس پر عمل کریں اور جو راہیں ہمارے لیے کھولی جاتی ہیں ان کی اطاعت کریں' اس کے باوجود ہم گرفتار ہیں' اسیر ہیں' غلام ہیں۔ پس بہتر ہے کہ ہم اپنی آنکھوں کو حد سے زیادہ نہ کھولیں اور جو کچھ حقوق و قانون' واصول و اخلاق و ضابطہ کے عنوان سے ہے ان سب کو ایک کنارے پر رکھ دیں اور ہر طرح کے قید و بند سے آزاد ہو جائیں۔ لہٰذا کہتے ہیں کہ عدالت بُری چیز ہے کیونکہ بارہا و بارہا عدالت کے نام پر ظلم کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آزادی بُری چیز ہے کیونکہ اکثر اوقات آزادی کے نام پر غلام بنایا گیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ تمام تر اصول یہاں تک کہ ان میں سے بہترین اور معروف ترین کو بھی ایک طرف

رکھ دیا جائے اور خود کو آزاد کر لیا جائے۔

نئی اسارت

شاید یہ ان پابندیوں کا ردعمل ہو کہ ان لوگوں نے کہا کہ علم کو علمِ کلام اور مسیحی عقائد کی قید و بند سے آزاد کیا جائے۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ انسان کو آزاد رہ کر سوچنے کا موقع دیا جائے، لیکن ہوا یہ کہ جب بازارِ علم میں رونق ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ علم بڑی قوتوں کا اسیر ہو چکا ہے۔ یعنی یہ کہ اپنی حکومت اور اقتدار کی وسعت اور اس کے نفوذ کے لیے بڑی طاقتوں نے علم کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ علم جنگ و جدال کے شعلے بھڑکانے میں استعمال کیا جانے لگا ہے، بڑے بڑے محلات کا زر خرید غلام، استعمار کا خادم و خدمت گزار اور طاقتوروں کے سامنے دست بستہ کھڑا نظر آیا۔

علم ایک طرف سے آزاد ہوا اور دوسری طرف غلام بن گیا، مسیحی کلیسا کے زندان سے آزاد ہونے والا انسان اس مقام پر پہنچا جب آنکھ کھلی تو خود کو بڑی طاقتوں اور استعمار کا غلام پایا۔ یہاں تک کہ ان معاشروں میں جہاں جمہوریت کا ڈنکا بجتا ہے وہاں پر بھی فیصلے پہلے سے ہونے لگے۔ افراد کا انتخاب پہلے سے کیا جانے لگا۔ اور ظاہر یہ کیا گیا کہ ہر قسم کے مسائل حل ہو گئے ہیں اور ہر ایک کو ہر قسم کی سہولیات دی گئی ہیں، ایسی صورت میں انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ خود ہی سفر طے کر رہا ہے لیکن اس بات سے غافل ہے کہ اسے لے جایا جا رہا ہے۔ ان آداب و قوانین اور معیارات کا انکار اس بات کا باعث بنا کہ انسان ایک نئی قید میں گرفتار ہو گیا اور نئے زندان میں جا پھنسا۔

حقیقی آزادی

اب ہم اسلام کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیں گے۔ اسلام کہتا ہے کہ پیغمبر اس لیے آئے تاکہ انسان کو قید و بند سے نکالیں اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالیں تاکہ لوگ آزادی اور

اختیار سے راہ کا انتخاب کر سکیں۔(۱)

پس اسلام کا انسان خدا کے مدِ مقابل ہونے کے بجائے اس کی طرف محوِ سفر ہے یہ انسان خدا کی طرف پرواز کر رہا ہے خدا کے مدِ مقابل نہیں۔قرآنِ مجید کے مطابق:

''یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ۔''

''اے انسان تو اپنے پروردگار کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے تو ایک دن اس کا سامنا کرے گا۔''(۲)

''...وَاِلَی اللّٰهِ الْمَصِیْرُ۔''

''...اور اسی کی طرف سب کی بازگشت ہے۔''(۳)

اسلام کا انسان نہ صرف معرفت سے محروم نہیں بلکہ اس کے برعکس اس انسان سے خدا چاہتا ہے کہ یہ معرفت حاصل کرے۔''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا...''(۴)

پھر خدا فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس انسان کو سجدہ کریں اور یوں علم کو انسان کی شخصیت اور عزت و عظمت کا راز قرار دیتا ہے۔اسلام میں شجرۂ ممنوعہ سے مراد علم و معرفت نہیں بلکہ پست و مادّی لذتیں ہیں' اور نفحۂ الٰہی کے چشمہ سے سیراب ہونے والے انسان کو ان عارضی اور وقتی لذتوں' تھوڑے سے منافع اور اسے طرح ہوا و ہوس کی بے لگام سواری پر سوار ہونے سے روکا گیا ہے اور ان کی اسیری میں جانے سے روکا گیا ہے۔ اس

۱۔وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ...اور ان پر سے احکام کے سنگین بوجھ اور قید و بند کو اٹھا دیتا ہے۔سورۂ اعراف ۷۔آیت ۱۵۷

۲۔سورۂ انشقاق ۸۴۔آیت ۶

۳۔سورۂ نور ۲۴۔آیت ۴۲

۴۔اور خدا نے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کی تعلیم دی۔سورۂ بقرہ ۲۔آیت ۳۱

کے باوجود انسان کی یہ معصیت اس کے آزاد ہونے کی علامت ہے پس اس وقت خدا کہتا ہے کہ اے انسان! میں نے تمہیں ایسی آزادی دی ہے کہ اگر تم میرے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرو اور معصیت کرو تو اس گناہ کے سبب تمہیں اپنے سے دور کرونگا مگر ہمیشہ کیلیے نہیں۔

"ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى۔"

"پھر خدا نے انہیں چن لیا اور ان کی توبہ قبول کرلی اور انہیں راستہ پر لگادیا۔"(۱)

حضرت آدمؑ پھر سے برگزیدہ قرار پاتے ہیں، پھر سے ان کی توبہ قبول ہوتی ہے اور ہدایت کی جاتی ہے اس کے بعد پھر خطاب ہوتا ہے کہ

"قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔"

"ہم نے کہا تم سب اس سے اتر جاؤ۔ اس کے بعد اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے۔ تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔"(۲)

اسلامی انسان وہ انسان ہے جو الٰہی روح اور خدائی آواز کے ساتھ خاک کے پست بستر سے "حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ"، "طِيْنٍ لَّازِبٍ"، "تراب"(۳) تک عروج پاتا ہے اور خدائی روح اس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو صاحبِ علم ہے۔

۱۔ سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۱۲۲

۲۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۸

۳۔ یہ تینوں قرآنی تعبیرات ہیں جو انسانی تخلیق کے اولین مادے کے بارے میں آیات قرآنی میں موجود ہیں، سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۲۶، سورۂ صافات ۳۷۔ آیت ۱۱۔ (د)

"عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔"

"اور انسان کو وہ کچھ پڑھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔" (۱)

وہ انسان جو آزادی کی دولت سے مالا مال ہے اور تشخیص کی قدرتوں سے لیس ہے وہ مسئول بھی ہے اور وہ بھی مسئول خودسازی۔

"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔"

"بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کا تزکیہ کیا۔" (۲)

یہی انسان معاشرہ سازی اور اپنے اردگرد کے ماحول کو بہتر بنانے کی ذمہ داری رکھتا ہے:

"فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ"

"تو تمہارے پہلے والے زمانوں اور نسلوں میں ایسے صاحبانِ عقل کیوں نہیں پیدا ہوئے ہیں جو لوگوں کو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔" (۳)

غیرت مند اور ہمت و حوصلہ رکھنے والے بہادر اور شجاع افراد گزشتہ اقوام و ملل میں کیوں نہ تھے جو برائیوں کا مقابلہ کرتے اور فساد برپا ہونے سے روکتے۔؟

پس اسلام کا انسان بلندی کی طرف پرواز کرنے والا ہے اور اس کے معنوی کمال کی منزل بڑی وسیع و عریض ہے جس کی انتہا خدا ہے۔ ایسا انسان ہیومن ازم کے جال میں نہیں پھنس سکتا کیونکہ وہ کوئی اسیر نہیں ہے جسے آزاد کرنا چاہیں' ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ مختلف ذریعوں سے اسے مقید کر دیا گیا ہو۔

۱۔ سورہ علق ۹۶۔ آیت ۵
۲۔ سورہ شمس ۹۱۔ آیت ۹
۳۔ سورہ ہود ۱۱۔ آیت ۱۱۶

جبر یا کشش

ہماری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان کی آزادی کے لیے خدا کی نفی کرنا ضروری نہیں بلکہ ہمارا مدعا یہ ہے کہ انسان کی آزادی بھی پروردگارِ عالم کی عطا ہے اور خدا چاہتا ہے کہ انسان آزاد ہو اور ایک مثالی وجود اور فرد پر منحصر وجود انسان کے نام سے خلق کرے۔

البتہ آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان جونہی ارادہ کرے کہ یہ کام ہو جائے تو وہ ہو جائے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ انسان کے اندر کی قوتیں چاہے مادی ہوں یا معنوی، اس کے میلانات، اس کی صلاحیتیں، ارد گرد کا ماحول، جغرافیائی عوامل، اجتماعی روابط، رسم و رواج یا وہ آداب جو انسان نے کسب کیے ہیں، تربیت اور وراثت جیسی چیزیں انسان کی آزادی کو محدود کر دیتی ہیں لیکن ان سب کے باوجود بھی انسان آزاد ہے، ارادہ کرتا ہے اور انتخاب کا حق رکھتا ہے۔

البتہ ایسا نہیں کہ بغیر کسی قانون کے انسان رات کو خواب دیکھے اور دوسرے دن اس کی تعبیر پا لے۔ آزادی کا مطلب یہ نہیں بلکہ ایک آزاد انسان کو جاننا چاہیے کہ اس کے ارد گرد کا ماحول کیسا ہے، جغرافیائی حدود و قیود کون کون سی ہیں، اقتصادی صورت حال کیسی ہے؟ کس قسم کے گھرانے میں پیدا ہوا ہے، کیسی تربیت ہوئی ہے اور کیسی ثقافت کے اندر رہتے ہوئے بڑا ہوا ہے۔ اب اس انسان کو چاہیے کہ وہ ان تمام عوامل کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرے تاکہ وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے اور آگے بڑھ سکے۔

واقع بینی یا واقع گرائی (Pragmatism or realism)

البتہ رئیل ازم کبھی واقع بین کے عنوان سے اور کبھی واقع گرائی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بعض اوقات بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارا موحول ہی ایسا ہے، ہم کیا کریں یہ لوگ درحقیقت ماحول میں ڈھل جاتے ہیں اور جو کچھ ہے اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتے

ہیں۔اس کو کہتے ہیں ''واقع گرائی'' (realism) کیونکہ ایسا ہے لہٰذا وہ بھی خود کو اسی راہ پر ڈال دیتا ہے اور لہروں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور واقعیت (fact) کے سامنے تسلیم ہو جاتا ہے۔ اسلام اس کو ٹھیک نہیں سمجھتا بلکہ واقع بینی اور اصول گرائی چاہتا ہے۔ یعنی انسان اگر کوئی کام انجام دینا چاہتا ہے اور مقصد وہدف تک پہنچنا چاہتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس راہ کی مشکلات کون کون سی ہیں' کہاں سے گزر کر جانا ہے بغیر سوچے سمجھے نہیں کود پڑنا چاہیے۔ فرض کریں میں کسی شہر میں جانا چاہتا ہوں تو مجھے چاہیے کہ میں معلوم کروں کہ کون سا راستہ اختیار کروں' زادِراہ کے طور پر کس چیز کی ضرورت ہے اس راہ میں کون کون سی مشکلات آڑے آسکتی ہیں۔ اچھی طرح واقعیت (fact) کو سمجھوں اور پھر اس کے مطابق تیاری کروں تاکہ مقصد وہدف تک پہنچ پاؤں۔

اور اگر میں بغیر کوئی معلومات کیے' زادِراہ آمادہ کیے بغیر اور مشکلات کے حل کرنے اور ان کو ختم کرنے کی تیاری کیے بغیر سفر کے لیے نکل پڑوں تو میں درحقیقت واقعیت سے دور بھاگ رہا ہوں۔

بس انسان آزاد ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جس کا ارادہ کرے وہ فوراً ہو جائے بلکہ رکاوٹوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آزاد ہے۔ البتہ یہ رکاوٹیں انسان کو مجبور نہیں کرتیں کہ وہ بالکل آگے نہ بڑھے اور کوئی قدم بھی نہ اٹھائے اسی طرح انسان کے اندر پائے جانے والے جنسی میلانات' بھوک کے احساسات' شہرت طلبی اور مقام ومرتبے کی تڑپ اپنی جگہ پر بڑی کشش رکھتے ہیں' بڑے جاذب نظر ہیں اور ہر ایک کو اپنی طرف کھینچتے ہیں (البتہ کبھی کبھار یہ اتنے شدید ہوتے ہیں کہ انسان کو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں) اس کے باوجود بھی انسان ان کے ہاتھوں مجبور نہیں جیسا کہ کوئی شخص شہوت کی آگ میں اتنا جلے کہ وہ گناہ سے اپنا دامن آلودہ کرنے لگے تو ایسی صورت میں بھی یہ شخص اپنی قوتِ ارادی سے اس کا سدِباب کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو مستحکم ارادے کی مدد سے اس گناہ کی دلدل میں گرنے

سے بچا سکتا ہے۔ اسی طرح وہ نشہ باز کہ جو بیس سال سے نشہ کر رہا ہے وہ اب اس نشہ کے ہاتھوں اتنا مجبور ہو چکا ہے کہ اس کو ترک نہیں کر سکتا لیکن اگر وہ اپنی قوتِ ارادی سے اور مصمم ارادے کی مدد سے اس بیس سالہ عادت تو کیا تیس سالہ عادت کو بھی ترک کر سکتا ہے۔ یہی نفخۂ الٰہی ہے اور یہی روحِ مقدس ہے کہ جو انسان کے اندر شعلہ ور ہوتا ہے اور انسان ارادہ کرتا ہے اور اسی عزم و ارادے ہی کی وجہ سے کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

البتہ بعض اوقات گناہوں، لغزشوں، جنسی بے راہ روی، دنیا پرستی، غلامی وغیرہ کی وجہ سے انسان کی قوت ارادی آہستہ آہستہ کمزور ہونے لگتی ہے اور انسان کمزور و سست ہونے لگتا ہے جبکہ اس کے برعکس ریاضت، خودسازی، مقاومت انسان کے ارادے کو قوی تر کر دیتے ہیں۔ ارادہ ہمیشہ ایک حال میں نہیں رہتا بلکہ کبھی کمزور ہو جاتا ہے اور کبھی قوی ہو جاتا ہے۔ البتہ انسان کو استقامت دکھانی چاہیے اور عزم و ہمت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

اسلام نے بعض چیزوں مثلاً نماز، روزے وغیرہ کا حکم دیا ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ارادے میں پختگی آئے اور انسان قوی تر ہو سکے تاکہ ان ریاضتوں اور مصائب و آلام کا مقابلہ کر کے اپنی تربیت کرے اور اپنے ارادے و عزم کو طاقتور بنا دے اس کے برعکس اگر انسان فقط منصوبے بناتا رہے اور کوئی عملی قدم نہ اٹھائے، تدبیر نہ کرے مقاومت اور سعی و کوشش کا دامن نہ تھامے اور خیالی پلاؤ پکائے تو یہ ایک منفی، سرد، خاموش، بے رونق اور بے احساس آئیڈیل ازم ہو گا۔ بنابریں تمام تر محدودیت اور حاکمیت کے ساتھ مشیتِ الٰہی ہمیشہ ساتھ ہے اور کبھی ہماری آزادی، تحرک، طاقت اور اقدامات سے منافات نہیں رکھتی ہے۔

چوتھا راستہ

بعض موجودات کی غلط تفسیر

چوتھا راستہ جو اس بحث اور گزشتہ ابحاث کی تکمیل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو ملحد ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کائنات، انسانی زندگی اور انسانی معاشرے میں کوئی نظم و ضبط موجود نہیں جس کا مطلب یہ ہے اس کائنات میں کسی انتظام کرنے والے کا کوئی وجود نہیں، کوئی اس نظام کا چلانے والا نہیں اور کوئی خالق نہیں اس لیے کہ بہت ساری چیزوں میں نظم نہیں اور وہ فضول ہیں۔

مثال کے طور پر کوئی شہد کی مکھی کے حالاتِ زندگی کا جائزہ لے تو کہے کہ کم و بیش ہزار نر مکھیاں فقط کھانے پینے میں لگی ہوئی ہیں اور ان کا کوئی کام نہیں صرف اس لیے کہ ان میں سے کوئی ایک ملکہ کو حاملہ کر دے، لیکن وہ کاریگر مکھیاں ایسی نہیں ہیں یا اپنڈیکس یا اضافی رگ کس لیے ہے؟

یا مثال کے طور پر مرد حضرات کے سینے پر موجود پستان کس مقصد کے لیے ہیں؟

یا بیابانوں اور جنگلوں میں اگنے والی جڑی بوٹیاں اور گھاس کس لیے؟

یہ پتھر جو زمین پر ادھر ادھر موجود ہیں کس لیے؟

یا وہ شہابِ ثاقب یا دیگر پتھر جو ٹوٹتے اور پھر فضا میں پھیلے ہوئے ہیں کس مقصد کی خاطر ہیں؟

المختصر ان حضرات کی نگاہ میں جو بدنظمی پائی جاتی ہے اور جن چیزوں کو اس مقصد کے لیے بیان کرتے ہیں اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ یہ کہیں کہ اس کائنات میں کوئی قاعدہ وقانون موجود نہیں ہے بالخصوص وہ بدنظمی جو بشری زندگی میں ملاحظہ کرتے ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ کیوں ایک فقیر اور دوسرا امیر ہے؟ کیوں ایک بیمار اور دوسرا صحت مند ہے؟ کیوں ایک ضعیف و کمزور اور دوسرا قدرت و طاقت والا اور صاحب مقام و چشم؟ کیوں ایک خطۂ زمین انتہائی زرخیز، بارونق اور سرسبز و شاداب اور دوسرا خطہ بے آب و گیاہ وخشک صحرا ہے؟ کیوں ایک کُند ذہن اور دوسرا باہوش اور ذہین ہے؟ کیوں ایک پیدائشی نابینا ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

بعض مادہ پرست فلاسفرز جو اپنی ظاہری نمود و نمائش کے چکروں میں ہیں اور اپنے قارئین کی نگاہوں کو خیرہ کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ ان ہی مسائل کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات پر کوئی مؤثر غیر از کائنات موجود نہیں ہے بلکہ یہ کائنات اندھی و بہری ہے۔ البتہ اگر ہم چاہیں تو اس کو ربط دیں اور اس میں نظم پیدا کریں اور اگر ہم ایسا نہ کرسکیں تو یہ کائنات اپنی بدنظمی کے ساتھ یوں ہی چلتی رہے گی۔ یہ ہے خلاصۂ کلام۔

اس اعتراض کے دو پہلو ہیں ایک کا تعلق پہلی بحث سے ہے جبکہ دوسرے کا تعلق اسی بحث سے ہے۔ وہ پہلو جو پہلی بحث سے مربوط ہے وہ یہ دعویٰ ہے کہ کائنات میں کوئی نظم وضبط موجود نہیں اور دوسرا پہلو اس دعویٰ سے تعلق رکھتا ہے کہ بشری زندگی میں بدنظمی پائی جاتی ہے اور ان کا آپس میں کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔

عدم کا علم یا عدمِ علم

اعتراض کے پہلے حصے کے جواب میں عرض ہے کہ ان مسائل میں سے کچھ کہ جن

میں بدنظمی کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس وجہ سے ہیں کہ ان کے بارے میں معلومات نہیں جیسے کہ میں نہیں جانتا کہ فلاں پتھر وہاں کیوں ہے؟ یا فلاں سیارے کی شعاعیں کس مقصد کے لیے ہیں؟ یا اسی طرح ہاتھی کی سونڈ کیوں خلق کی گئی ہے؟ میں چونکہ ان کے بارے میں آگاہی نہیں رکھتا اسے لیے ان کو بے فائدہ سمجھ رہا ہوں کیا ایسا نہیں ہے کہ علم و ٹیکنالوجی کی اس قدر ترقی نے بہت ساری ان اشیا کہ جن میں بدنظمی کے دعویٰ کیے جاتے تھے ان کو دلیلِ نظم قرار دیا ہے؟

چیونٹیوں کے antenna اور بلی کی مونچھیں فضول سمجھی جاتی تھیں اور بعض یہ سمجھتے تھے کہ صرف خوبصورتی کے لیے ہیں جب کہ اب واضح ہو گیا ہے کہ یہ antenna راستہ تلاش کرنے کے کام اور درست راستے پر چلنے کے لیے ہیں اور مونچھیں توازن برقرار رکھنے کے لیے ہیں۔ اسی طرح جب تک کیمیا دانوں نے سانپ کے زہر کی مختلف خاصیتیں دریافت نہیں کی تھیں تو لوگ کہتے تھے کہ یہ کیوں ہے؟ لیکن جب یہ خاصیتیں منظر عام پر آ گئیں کشف ہو گئیں، تو وہ سارے باطل تصورات مٹی کی دیوار کی طرح ملیا میٹ ہو گئے۔ دراصل ہر چیز میں نظم دیکھنے کو ملا اور ہر چیز قاعدہ و قانون کے سایہ میں نظر آنے لگی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر مطالعہ کی ضرورت ہے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے اگر انسان کہیں پر بے نظمی دیکھے تو اس کائنات میں اس کے تار پود کی جستجو کرے اور انہی مادی اشیاء میں اس کا سراغ لگائے اور دیکھے کہ واقعاً بے نظمی ہی ہے یا اس چیز کے نظم کو تلاش نہیں کیا گیا؟

عدمِ علم، عدم کے بارے میں علم حاصل کرنے کے علاوہ ہے۔ انسان کبھی یہ سمجھتا ہے کہ نظم نہیں اور کبھی یہ نہیں جانتا کہ نظم ہے، غالباً یہ لوگ نہیں جانتے کہ نظم موجود ہے۔ نظم اور علت و وجہ کو نہ سمجھنا، اشیا کی مختلف جہتوں کو نہ ماننا اور کائنات میں مختلف اشیا کے ربط و تعلق کی تشخیص نہ دے سکنا اس بات کی دلیل نہیں کہ نظم نہیں پایا جاتا۔

نظم و ضبط پر اکتفا

دوسری بات یہ ہے کہ وہ لوگ بعض اشیاء میں بدنظمی ثابت کر کے ناظم کے وجود کا انکار کرنا چاہتے ہیں البتہ وہ چیزیں جن میں نظم و ضبط کے وہ بھی قائل ہیں اسی سے ہی ہم خدا تک پہنچتے ہیں۔ قبل اس کے کہ تم اشیا کے درمیان بدنظمی کو ثابت کر کے خدا کی نفی کرو ہم ان چیزوں سے جن میں نظم و ضبط پایا جاتا ہے خدا کو ثابت کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں پائی جانے والی اشیا میں سے کوئی ایک منظم شئے جیسے شہد کی مکھی یا کوئی اور پرندہ بھی ایک خالق اور ناظم کے وجود کی خبر دیتا ہے۔ یا اس خاک شناس کے بقول کہ جو ایک مٹھی خاک میں پائے جانے والے اجزاء اور ان کے درمیان پائے جانے والے ربط و تعلق کو دیکھ کر کہتا ہے کہ میں سمجھ گیا کہ کوئی حکمت کارفرما ہے اور کوئی قدرت موجود ہے۔

ایک بڑی مہارت سے بنی ہوئی خوبصورت تصویر بھی کسی صانع کی مہارت اور صنعت گری پر دلالت کرتی ہے اگرچہ بے ڈھنگی تصاویر کا ڈھیر ہی پاس کیوں نہ پڑا ہو۔ ہم اس ایک خوبصورت و دلفریب تصویر ہی سے جان لیتے ہیں کہ کوئی نقاش اور آرٹسٹ موجود ہے اور ہمارے لیے یہی کافی ہے ہماری بات کے اثبات کے لیے ایک چیز کا نظم ہی کافی ہے۔

اگلا مرحلہ بعد کا ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ اس خدا کے تمام کام حکمت کے تحت ہیں یا نہیں۔ البتہ یہاں آپ کی بات زیر بحث لائی جا سکتی ہے جبکہ ہم اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا حکیم بھی ہے۔

ممکن ہے کہ وہ کہیں کہ چونکہ خدا کا فلاں کام حکمت کے تحت نہیں اس لیے اس کے تمام کاموں میں حکمت نہیں۔ ایسی صورت میں ہم یہ جواب دیں گے کہ کیا تم نے جان لیا

ہے کہ سارے افعال حکیمانہ ہیں یا نہیں یا اس کی حکمت کو جان نہیں سکے؟ پس مختصر یہ کہ ایک چھوٹے سے نظم سے بھی ہم ناظم (خدا) کے وجود کو ثابت کر سکتے ہیں۔

مختلف ہونے میں حکمت کا وجود

دوسرے پہلو کے حوالے سے اس نشست میں ایک اشارہ کیے دیتا ہوں کہ انسانوں کی شکل وصورت، جسامت، سریلی آواز، لہجہ، آنکھوں کی بینائی وغیرہ ہو یا اکتسابی پہلو مثلاً دولت، علم، قدرت، اجتماعی مقام ومنصب وغیرہ ہو ان سب میں اختلافات کی وجہ بھی کسی قانون اور کسی نظم کے تحت ہے۔

اگر کوئی جسم لاغر ہے تو اس لاغرپن اور ضُعف کے پیچھے کچھ اسباب کارفرما ہیں، کچھ وراثتی مسائل کارفرما ہیں، انتخاب ہمسر، حمل کے دوران کی غذا، حمل کے دوران ماں کی ذہنی واجتماعی کیفیت، تولد کے وقت حالات اور ماحول، بچے کی غذا کی کیفیت اور نوعیت، صفائی ستھرائی کا انداز اور اسی طرح معاشرتی ماحول یہ سب وہ علل واسباب ہیں جو بچے کے جسم، قدوقامت اور شکل وصورت کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان اسباب وعلل میں کچھ ایسے ہیں جو ہمارے اختیار میں نہیں اور کچھ ہمارے اختیار میں ہیں کہ جن کی مدد سے ہم بہتر نتیجہ دے سکتے ہیں۔

اسی وجہ سے اسلام نے ازدواج، نوع تغذیہ، روابط کا انداز اور اسی طرح کے دیگر مسائل کے حوالے سے احکامات جاری کیے ہیں۔ اگر کبھی کوئی غور وفکر کرے اور دیکھے کہ کوئی نابینا ہے، کوئی بیمار ہے، فلاں ملک میں لوگ فلاں بیماری میں مبتلا ہیں، دنیا میں اکثریت فقر کی حد سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے، کافی ووافی غذا مہیا نہیں، دنیا میں دس فیصد (10%) لوگ کل دولت کے ستر فیصد (70%) حصے پر قابض ہیں اور پھر یہ نتیجہ نکال لے کہ اس جہان میں کوئی مالک نہیں اس لیے کہ اگر ناظم ہوتا تو ان کاموں کو

منظم کرتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے نظم وضبط کا ذمہ دار اس نے تمہیں بنایا ہے، کیا خود انسان اس طرح کے نظم کو قائم کر سکتا ہیں؟ کیا یہ خود تیار ہیں کہ ان اختلافات، کمیوں کمزوریوں، خود پرستی اور چالاکیوں اور دھوکہ وفریب کا مقابلہ کریں یا نہیں؟ پہلے یہ بتایا جاچکا ہے کہ پکی پکائی روٹی اور غذا تمہارے حلق میں نہیں ڈالی جائے گی۔ اے انسان تو اپنی غذا کا خود ذمہ دار ہے اس کو تلاش کر، اس کے حصول کی کوشش کر اور اجتماعی نظام کی تشکیل کر، اس کو منظم کر، اقتصادی روابط کو مستحکم کر یہی اس کا قانون ہے اور یہی سنتِ الٰہی ہے۔

اس طرح کا اعتراض کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہر قسم کا حرج مرج، اختلاف، بدنظمی اور اجتماعی ناہمواریاں خدا کی طرف سے ہیں اور خدا اس فکر میں لگا ہوا ہے کہ فلاں شخص بیمار ہو، فلاں تندرست وسالم ہو، فلاں اِس طرح ہو اور فلاں اُس طرح۔ اس طرح کے تمام مسائل کے لیے ایک قانون موجود ہے، ایک ضابطہ موجود ہے۔ ان تمام قوانین کے درمیان ایک اور قانون بھی ہے اور وہ آزادیٔ ارادہ، خلاقیت کی قوت اور انسان کی فعالیت ہے۔ انسان کیوں معاشرہ سازی نہیں کرتا؟ اپنے امور اور روابط کو نظم کیوں نہیں دیتا؟ کیوں عدل وانصاف کے لیے کوشش نہیں کرتا، کیوں امن وسلامتی اور رشد وارتقاء کے لیے جدوجہد نہیں کرتا؟ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی شخص ایسا گھر تعمیر کرے جو انتہائی خستہ حال ہو اور پھر خستہ حال چھت کے نیچے جا بیٹھے اور پھر یہ انتظار کرے کہ چاہے زلزلہ ہی کیوں نہ آئے یا کوئی اور آفت وہ محفوظ ومامون رہے گا۔ ایسا نہیں ہے! اگر زلزلہ آئے گا تو یقیناً وہ آپ کی بربادی کا سبب بنے گا۔ یہ بے توجہی اور عدم توجہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ یہ سستی وکاہلی، بدنظمی، عدم تدبیر انسان کے حرکت نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ اس بنا پر بہت ساری اجتماعی ناہمواریاں انسان ہی کی وجہ ہیں اور خود انسان ہی ہماری نظر

میں قصوروار ہے۔ہم یہ نہیں کہتے کہ انسان جس کو درست کرنا چاہے درست کرلے گا بلکہ اس کے ارادہ کے علاوہ بھی کچھ اسباب پائے جاتے ہیں' اس آزادی کا مطلب مطلق آزادی نہیں۔

لہٰذا ممکن ہے کہ تمام تر اصول وقوانین اور احتیاطوں پر عمل کے باوجود کہیں نابینا یا اپاہج پیدا ہو جائیں کیونکہ اسکے علاوہ بھی عوامل موجود ہیں۔لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اولاً یہ سب قانون کے تابع ہیں یہ بدنظمی نہیں ہے' سب کچھ نظم ہے اور ان میں بہت سے روابط وایجادات' تدابیر اور ظلم وستم خود انسانوں کے اپنے ایجاد کردہ ہیں۔

پانچواں راستہ

دین کی نگاہ میں
انسان اور معاشرہ شناسی کی تفسیر

الحادی فکر کی ایک اور کڑی عقیدۂ خدا کی وہ تفسیر وتشریح ہے جو الحادی فکر رکھنے والوں نے انسان اور معاشرے کے حوالے سے کی ہے۔ یعنی خدا کا عقیدہ اور دین کی طرف میلان انسان کے اندر رونما ہونے والی کیفیات اور حالات سے جنم لیتا ہے اور معاشرے کے تکاملی سفر سے پھوٹتا ہے۔ اور اگر ہم اس پر بحث کریں تو شاید آپ کی نظر یہ ہو کہ اس کے اندر دو تین علیحدہ ابحاث ہوں گی مگر ہم ان سب ابحاث کو ایک ہی فصل میں خلاصہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ: تفسیر بشری واجتماعی، تفسیر انسانی وجامعہ شناسی۔

ا۔ جہالت اور خوف کا پیدا ہونا

آپ نے سنا ہوگا کہ اکثر اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ جہالت اور خوف عقیدۂ خدا کا باعث بنا۔ چونکہ لوگ کائنات میں ہونے والی مختلف قسم کی تبدیلیاں اور رونما ہونے والے حادثات کو نہ سمجھ پاتے تھے اور انہوں نے ان حادثات کے علل واسباب کو جاننے کی سعی وکوشش میں مختلف توجیہات کرنا شروع کیں اور یوں خدا تک جا پہنچے یا درپیش مشکلات اور مختلف آفات سے بچنے کے لیے پناہ گاہوں کے متمنی تھے۔ سیلاب، طوفان، زلزلہ، گرج چمک اور اسی طرح کے دیگر خطرات سے بچنے کے لیے اپنے تئیں ایک پناہ گاہ تراشی اور یہ پناہ گاہ بالآخر عقیدہ خدا کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح اس نادان اور ڈرپوک انسان

نے اپنے لیے خدا بنا لیا اور اس خدا کے سامنے تواضع وانکساری اور تذلل کرنے لگا۔

۲۔ معاشرہ شناسی کی تفسیر

کچھ خاص تعبیروں اور تفسیروں کے تحت جو بعض معاشرہ شناس نظریات میں پائی جاتی ہیں' کہتے ہیں کہ معاشرہ دینی لحاظ سے تین مراحل میں تقسیم ہوتا ہے۔ایک مرحلہ خرافات ہے۔ اساطیر اور توہم پرست جو کہ پہلی بات پر ہی تکیہ کرتے ہیں یعنی ابتدا میں کائنات میں رونما ہونے والے واقعات کی انسان کوئی توجیہ نہ کر پاتا تھا جس وجہ سے بے سروپا تصورات گھڑ لیے جیسے توتم ازم (totemism) اور اینیم ازم (animism) (۱) اور پودوں اور حیوانوں کی ارواح کو مانتے تھے اور اس کو کائناتی شعور وحیات سے تعبیر کرتے اور انکو ان حوادث و واقعات پر حاکمیت دیتے' مختلف انواع کے خداؤں کا عقیدہ رکھتے اور ایسے خداؤں کا تصور جو کسی قبیلہ کی روح کی صورت میں ظاہر ہوتا اور اجداد یا جدا علیٰ کی صورت اختیار کر لیتا اور یوں بت پرستی اور بت سازی کا آغاز ہوا۔

انہی توہمات' خرافات اور افسانوں ہی کی وجہ سے بت پرستی ہوئی اور بت سازی کا کام عمل میں آیا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ بت پرستی کی تاریخ انسان کے انہی تفکرات و توہمات کا مختلف شکلوں اور علاقوں میں نمودار ہونے سے عبارت ہے' جیسے کبھی فطرت کی روح' کبھی پودوں اور حیوانوں کی روح اور کبھی قبیلے یا سردارِ قبیلہ اور اسی طرح کبھی ایک پورے معاشرے کا سربراہ' غرض یہ کہ جب بھی ان ارواح کو تجسّم کی صورت میں لانا چاہتے تو مختلف شکلوں میں بت اپنے لیے بنا ڈالتے اور اپنے توہمات کے لیے بطور نشانی قرار دیتے۔ بہر حال ان بتوں کی پرستش کی بنیاد اپنی نادانیوں' خوف و ہراس اور انہیں اپنے لیے پناہ گاہ کی توجیہ قرار دینا تھا۔ پس سابقہ معاشرے کی تفسیر کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ شروع شروع

۱۔ قدرتی چیزوں کو جاندار سمجھنا

میں بشر خرافات اور توہمات کی وادی میں گم تھا اور ان انجانی اشیاء کی توجیہ کے لیے ان مسائل کی طرف راغب ہوا۔

پھر کہتے ہیں کہ زمانے نے ترقی کی اور دین کا زمانہ آیا یعنی وہ دور جب پیغمبر آئے البتہ ان ماہرین جامعۂ شناس کی نظر میں وہ لوگ پیغمبری کا دعویٰ کرتے تھے انہوں نے ان مختلف خداؤں اور ان بتوں سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر ایک خدا کی جانب مبذول کروائی اور پھر اسی خدا کی طرف سے قوانین کا مجموعہ لے آئے اور ان لوگوں کی جہالت اور نادانیوں کی توجیہ ماورئ ہستی اور ان کے خوف و ہراس کی توجیہ ایک خدا کی طرف متوجہ کرکے کی اور یوں خدا کی طرف راغب کیا اور ان لوگوں کے لیے پناہ گاہ گھڑ ڈالی یہاں تک کہ کئی صدیوں پر محیط یہ عرصہ بھی بیت گیا اور بالآخر علم کا دور آیا اور علم کے دور کے آتے ہی دین کا زمانہ کامل ہوگیا۔

البتہ ہم نے عرض کیا کہ اس قسم کی توجیہات ہم نے کئی بار سنی ہیں۔ اس قسم کی فکر کا بانی ''اگاست کانٹ'' تھا۔ ممکن ہے کہ دوسروں نے بھی فلسفیانہ افکار یا معاشرتی افکار و نظریات میں اس کو بیان کیا ہو لیکن یہ پہلا شخص ہے جس نے اس طرح کی فکر کو پروان چڑھایا اور بعد میں آنے والے مفکرین نے اسی فکر کو مستعار لیا ہے۔

۳۔ امراء اور سود خوروں کا وجود

بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا کا عقیدہ اور دین، سرکشوں، منافع خوروں، اُمَراء، مستکبرین اور استعمار کی پیداوار ہے۔ وہ لوگ جو دولت کے نشے میں سرمست تھے یا وہ لوگ جو قوت و اقتدار چاہتے تھے انہوں نے چاہا کہ اقوام و ملل کو اپنے حصار میں لیں یا دین کو ان پر مسلط کرکے معنوی حاکمیت حاصل کرلیں۔ پس اقتصادی، حکومتی یا دینی و معنوی تسلط قائم کرنے ہی کی خاطر چند قواعد و ضوابط، قوانین و افکار، آداب اور مختلف اقسام کے رسم

ورواج دین کے نام پر انہوں نے بنا ڈالے۔ مختصر یہ کہ خدا پر ایمان اور ادیان و مذاہب معاشرے کے ان لوگوں کی پیداوار ہیں جو ہوس ران، دولت واقتدار کے طالب اور مادی منافع کے پجاری تھے۔ اب چوتھے نظریے کی طرف رخ کریں شاید انہی کی کارستانی ہو۔

۴۔ مادی معاشرے کی حیات کی پیداوار کا سبب

ان کی نگاہ میں معاشرہ ہی مذہب کو لاتا ہے اور عقل وفکر اور ثقافت کی پیدائش کا باعث بنتا ہے۔ ہر فرد معاشرے کا حصہ ہے لیکن ان دونوں میں اصالت معاشرے کو حاصل ہے فرد کو نہیں۔(۱) فرد معاشرے کا ایک ایسا حصہ ہے کہ جو معاشرے کے ہاتھوں مجبور ہے اس کا اپنا کوئی مقام اور کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے بعد پھر کہتے ہیں کہ معاشرے میں مختلف قسم کی تبدیلیوں اور اقتصادی اتار چڑھاؤ کی وجہ سے تاریخ کا وجود ہے۔

پیداواری وسائل اور پیداواری طریقوں کے درمیان پیداواری تقسیم اور روابط کی نسبت جو تضاد ہے ان کی بنا پر معاشرے کی تبدیلی اور معاشرے کے ادوار وجود میں آتے ہیں۔

انسان بھی ایک طبیعی ومادی وجود ہے جو مادے اور طبیعت سے پیدا ہوا ہے۔ زندگی کا سب سے پہلا خلیہ (cell) اسی طبیعت اور خاک سے وجود میں آیا ہے یہ مادی مائنات میں ایک خاص جدلیاتی عمل کے تحت مختلف تبدیلیوں اور مختلف مراحل سے گزرتا ہے اور تکاملِ حیات وتکاملِ حیوان سے انسان تک پہنچتا ہے، اور انسان سو فی صد ایک طبیعی ومادی وجود ہے۔ اس کے بعد پھر کہتے ہیں کہ ان مادی واقتصادی تبدیلیوں کی وجہ تاریخ کا وجود ہے۔ اور معاشرے میں پائے جانے والے مذہبی افکار اور عقلی وفکری اور روحانی ومعنوی،

۱۔ یہ مسئلہ خود ایک علیحدہ بحث رکھتا ہے کہ ہم "نظریہ انفرادیت" individualism کی اصطلاح کو لیں یا سوشیالسٹ (socialists) کو؟ ہم اصالت 'فرد کو دیں یا اجتماع کو؟

تہذیب وثقافت مادی روابط کا عکس العمل ہیں۔

ان کی نظر میں فطرت تھی مگر ذہنِ انسانی نہ تھا' انسان کا ذہن' فطرت کے بعد وجود میں آیا ہے۔ یہ ذہن مادے کی پیداوار ہے جو چیز بھی ذہن میں آتی ہے اور جو فکری و عقلی کام ہوتا ہے اس کی وجہ مادہ ہے۔ پس تمام مابعد الطبیعاتی افکار اور دین معاشرے کے اقتصادی و مالی روابط کا نتیجہ ہیں۔ یہاں پر ہم پھر تیسرے اعتراض کی طرف پلٹتے ہیں جس میں وہ کہتے ہیں کہ معاشرے کے اجتماعی و اقتصادی حالات میں جب کوئی گروہ شدید مشکلات میں گرفتار ہو جاتا ہے تو یہ گروہ چند مادی اور مذہبی قوانین مرتب کرتا ہے اور اس گروہ یا لشکر کے مدمقابل جس کے ہاتھوں ایسی حالت تک پہنچا ہوتا ہے (یعنی طاغوت اور امراء) اپنی حالت کو درست رکھنے کے لیے کچھ توجیہات کرتا ہے مثلاً صبر' توکل' زہد' تسلیم و رضا وغیرہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔

یا اس کے برعکس ایک ایسا گروہ جوان مشکلات کا شکار ہوتا ہے' وہ عدالت و مساوات محروموں کی مدد و نصرت کے نام پر آگے بڑھتا ہے تاکہ وہ معاشرے میں پائے جانے والے تضاد میں اپنی خوراک مہیا کر سکے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ دین امراء اور اربابِ حل وعقد والے طبقے کی پیداوار ہے۔ اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ دین محروم و مستضعف لوگوں نے بنایا ہے۔ یا کم از کم دین کے بعض مسائل وقوانین اِس طرح اور بعض اُس طرح وجود میں آ گئے۔ بہر حال خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہماری معلومات کے مطابق دین امراء و اشراف نے گھڑا ہے اور صاحبانِ قدرت نے معاشرے کے محرومین کے مقابلے میں اپنے منافع کے لیے بطور حربہ استعمال کیا ہے۔ یہی اصل بحث ہے جو ملحدین اور منکرینِ خدا کا مؤثر ترین ہتھیار ہے۔

تحلیل بحث

ا۔محرک(motive)وتحرک(instigation) کا ٹکراؤ

اگر ہم اس اعتراض کا تجزیہ کریں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہالت اور خوف اور ان کی دیگر اقسام ہی خدا کو ڈھونڈنے کا سبب ہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا ہر قسم کی علمی وصنعتی ترقی کا باعث بننے والی چیز جہالت اور خوف نہیں؟ کیا ہر قسم کی علمی کوششیں، فلسفی تفکرات، وسائل و ذرائع اور صنعتی دنیا کی ابتدا جہالت و نادانی کے باعث منظر عام پر نہیں آئیں؟ کیا انسان نے اپنی جہالت کو دور کرنے، اشیائے کائنات کو جاننے اور اس کائنات کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کی توجیہ اسی احساسِ جہالت کے باعث نہیں کی ہے جس کے نتیجے میں نئی نئی راہیں کھلی ہیں، فلسفیانہ افکار پروان چڑھے ہیں؟ کیا ایسا نہیں تھا کہ انسان سردی، گرمی، طوفان، زلزلہ، سیلاب اور گرج چمک سے خائف تھا اور خوف کو دور کرنے کے لیے پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں تھا، آخرکار اس نے نت نئی ایجادات اور کئی انکشافات کیے مضبوط قلعے تعمیر کیے، دفاعی ساز وسامان بنائے؟ کیا بیماری ادویات بنانے کا مقدمہ نہیں؟ کیا ناتوانی قدرت حاصل کرنے اور اوزار بنانے کا مقدمہ نہیں جن کی مدد سے نئی سے نئی راہیں کھلیں، وسائل واسباب پیدا ہوئے اور آئے دن نئے سے نئے معرکوں کو سر کیا۔

خلاصہ ہر قسم کی صنعتی ترقی تدریجاً اس لیے ہوئی تا کہ ضروریات پوری کی جاسکیں اور انسان خوف سے محفوظ و مامون ہو جائے۔کوئی پناہ گاہ مل جائے پس جہالت اور خوف ہی باعث بنے کہ انسان کی ضرورتیں پوری ہوسکیں اور محفوظ پناہ گاہ مل جائے۔ذہن بشر کو نئے نئے انکشافات پر آمادہ کرنے والی اور ایجادات کی قوت کو ابھارنے والی چیز یہی جہالت اور خوف ہے۔ناتوانی قوت کا مقدمہ، جہالت علم کا مقدمہ، رنج والم آسائشوں کا مقدمہ اور محرومی نعمتوں کا پیش خیمہ ہے اگر یہ جہالت وخوف نہ ہوتے تو کسی قسم کی کوشش اور تحرک نہ ہوتا۔

''اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا''

''بے شک تکلیف کے ساتھ سہولت بھی ہے۔''(۱)

تکالیف اور مشکلات کے بعد ہی امید اور آسائش کا دریچہ کھلتا ہے۔ اس بنا پر ہم قبول کرتے ہیں کہ یہی بات درست ہے کہ انسان جاہل تھا' قدرت و طاقت سے عاری تھا اور خوف و ترس محسوس کرتا تھا اسی وجہ سے خدا کو تلاش کیا۔ لاعلمی' ناتوانی و خوف کی بنا پر فعالیت کا آغاز کیا۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اگر یہ سعی و کوشش اور تحرک ایک رہنما کے ساتھ ہو اور عقلی قوتیں بھی صحیح طور پر بروئے کار لائی جائیں' تب صحیح نتیجہ ممکن ہے لیکن اگر راہنما کے بغیر یہ سفر طے کیا جائے اور بغیر کسی معیار اور قانون کے آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے تو انسان غلط راہوں پر جا پہنچتا ہے۔ یہ سعی و کوشش ایک خاص جذبے کے تحت ہے لیکن صحیح راہنمائی نہ ہونے کی صورت میں مطلوبہ ہدف تک پہنچنا ممکن نہیں۔ پس ضروری ہے کہ کئی صدیاں گزر جائیں' انسان پھر ان افسانوں' قصہ کہانیوں اور خرافات کو چھوڑ کر بتدریج عقیدۂ خدا تک پہنچے جس طرح کوئی ماہر کسی بیماری کے علاج کے لیے دوائی بنانا چاہے تو کئی غلط تجربات کے بعد آخرکار وہ ایک موثر اور مفید دوائی بنانے کے قابل ہو جاتا ہے جو اس بیماری کا صحیح علاج ہو۔ پس جذبہ قوی تر ہونے کی بنا پر کئی سنگلاخ پہاڑی دروں' پُرپیچ راہوں سے گزرنے کے بعد ہی سیدھی اور پرثمر شاہراہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔ المختصر یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اگر جہالت اور خوف ہی سے شروع ہوا ہو تب بھی کوئی مانع نہیں۔

خدائی فطرت

اسلام کی نظر میں عقیدۂ خدا جہالت اور خوف کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ فطری ہے۔ خدا کی طرف رغبت والی فطرت انسان کے وجود میں موجود ہے۔ اسلام کی فطرت اس

۱۔ سورۂ انشراح ۹۴۔ آیت ۶

طبیعت کی مثل ہے جو انسان کی حقیقت میں شامل ہے۔ جس طرح انسان کی طبیعت پر کچھ قوانین کارفرما ہیں (اسی طرح حقیقت انسان پر بھی کچھ قوانین کارفرما ہیں)۔

"فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔"

"پس (اے رسولؐ) آپ باطل سے کنارہ کش ہو کر اپنا رخ دین (حق) کی طرف رکھیں یعنی اس (دین) فطرت کی پیروی کریں جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے یہی سیدھا دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔" (۱)

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام فطرتِ انسانی میں شامل ہے۔ (۲) امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں انبیاؑ کے آنے کی وجہ، خداشناسی، کائنات شناسی اور پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"فَبَعَثَ فِيهِمْ رُسُلَهُ وَ وَاتَرَ إِلَيْهِمْ أَنْبِيَاءَهُ لِيَسْتَأْدُوهُمْ مِيثَاقَ فِطْرَتِهِ وَ يُذَكِّرُوهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهِ وَ يَحْتَجُّوا عَلَيْهِمْ بِالتَّبْلِيغِ وَ يُثِيرُوا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُولِ۔"

"اللہ نے ان میں اپنے رسول مبعوث کیے اور لگاتار انبیا بھیجے تاکہ ان سے فطرت کے عہد و پیمان کو پورا کرائیں۔ اس کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں۔ پیغام ربانی پہنچا کر حجت تمام کریں۔ عقل کے دفینوں کو ابھاریں اور انہیں قدرت کی نشانیاں دکھائیں۔"

۱۔ سورۂ روم ۳۰۔ آیت ۳۰

۲۔ البتہ یہ موضوع خود وضاحت طلب ہے کہ انسان کی فطرت کیا ہے۔

خدا نے یکے بعد دیگرے کئی انبیاؑ ارسال فرمائے تا کہ وہ لوگوں کو اس عہد و پیان کو پورا کرنے پر آمادہ کریں جو انہوں نے خدا سے کر رکھا تھا اس بھولے ہوئے وعدے کو پھر اسے یاد دلائیں۔ لوگ حقیقت کو دریافت کرنے اور خدا تک رسائی کا جذبہ رکھتے ہیں لیکن بھول چکے ہیں اس سوئی ہوئی قوت کو بیدار کرنے اور ان غفلت کے پردوں کو ہٹانے کے لیے انبیاؑ تشریف لائے تا کہ لوگ اپنے حقیقی مقصد کی طرف گامزن ہیں۔

پس اسلام کی نظر میں خدا تک رسائی کا فطری جذبہ انسان کے اندر موجود ہے جو اچھائی، راہ کمال اور خیرِ مطلق کے حصول کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے۔ ہر انسان خدا کی طرف میلان رکھتا ہے اور وہ در حقیقت کمال کا طالب ہے بلندی کی طرف جانے والا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ مادیت سے نکل کر لامحدود ہستی کی طرف پرواز کرے۔ یہ فکر افسانہ اور خرافات نہیں کہ کسی نے آ کر اسے اس راہ پر ایسے لگا دیا ہو یا انسان خود اپنے لنگڑے پن کی وجہ سے اسے بطور عصا استعمال کرنے لگ گیا ہو بلکہ یہ اس کی فطرت و سرشت میں پائی جاتی ہے۔ خدا جوئی انسان کی اعلیٰ ترین صفت ہے جو انسان کی فطرت کی انتہائی گہرائیوں سے پھوٹتی ہے۔ یہ جہالت اور خوف و ہراس کا نتیجہ نہیں اور نہ ہی اندھے پن کی وجہ سے کہ جس نے اپنے چلنے کے لیے اسے گھڑ لیا ہو۔

۲۔ دو تاریخی ادوار کا ٹکراؤ

اس کے بعد یہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ تہذیبوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان فرضی کہانیوں کے بعد خدا تک پہنچا لیکن علم نے اس عقیدے کو خراب کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان نے پہلے پہل مظاہرِ فطرت کی پرستش شروع کی پھر آہستہ آہستہ اصول و شبیہ (symbols) تک پہنچا جیسے آزادی کا خدا، برکت کا خدا وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے لیے بت تراشے۔ یوں تدریجاً انسان آگے بڑھا اور

توانا و بالاتر خداؤں کا قائل ہوا اور خدائی قدرتوں کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ پھر مختلف انواع کے رب بن گئے پھر تین خداؤں کا قائل ہوا پھر دو خداؤں کو مانا اور بالآخر ایک خدا تک جا پہنچا۔ ان کا کہنا ہے کہ جوں جوں ذہنی و عقلی قوتیں بڑھیں انسان بھی تدریجاً شرک سے توحید تک پہنچا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے کے دو انداز ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہے۔ اب اس بات کا خیال رہے کہ یہ دونوں مخلوط نہ ہو جائیں۔ ایک انداز و طریقہ ایسے دینی تفکرات کا ہے جو بغیر وحی کے ہے یعنی انسان نے اپنی ہی سعی و کوشش سے اس کائنات کی تعبیر و تشریح کی۔ یہ وہی انداز ہے تقریباً کہ جو جامعہ شناسی کی بحث کے ضمن میں کہا جاتا ہے۔

تاریخ کے مطالعے کا ایک انداز اور بھی ہے جو پہلے کے برعکس ہے اور ان کا آپس میں ٹکراؤ نہیں ہونا چاہیے، یعنی انسان وحی کے ذریعے پہلے توحید پرست ہوا پھر آہستہ آہستہ معاشرے کے ہاتھوں یہ عقیدہ اسیر ہوتا چلا گیا۔ لوگوں نے مال و دولت کے لالچ میں کئی بے ڈھنگے رسم و رواج بنا ڈالے۔ دین دار لوگوں نے اپنے منافع کی خاطر اس کو پائمال کر دیا۔ اور یہ عقیدہ مختلف فلسفی افکار اور رسوم و رواج میں مخلوط ہونے کی وجہ سے توحیدی راہ سے ہٹ کر شرک کے ہاتھوں یرغمال بن گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت نوحؑ یا حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید کب شروع ہوئی؟

حضرت ابراہیمؑ نے چار ہزار سال قبل توحید کی دعوت دی تھی۔ آثارِ قدیمہ بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں لیکن دیکھا جائے تو جو تصور اس دور کے بارے میں معاشرہ شناسی والے کرتے ہیں اس کے مطابق یہ دور توتم ازم اور انیم ازم کا ہے۔ اور اس دور میں جو مسائل درپیش تھے آج بھی بت پرستی کی شکل میں ہیں۔ چاہے آج سے تیرہ چودہ سو سال پہلے کے زمانے میں چلے جائیں یا آج کے زمانے کو دیکھ لیں بت پرستی موجود ہے۔ آپ

ہندوستان، جاپانی یا مشرق بعید کے دیگر ممالک میں چلے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ مختلف انواع واقسام کے بت آج بھی موجود ہیں۔ حالانکہ عقیدۂ خدا اور توحید پرستی اس تاریخ کے مطابق جو تحریر شدہ ہے، کم وبیش چار ہزار سال قبل سے موجود ہے۔ البتہ قرآن کے مطابق تو اس وقت سے یہ عقیدہ اور توحید پرستی انسان کے ساتھ ساتھ ہے جب سے انسان نے روح کے ساتھ اس معاشرے میں قدم رکھا اور آدمؑ کی تخلیق ہوئی۔

”وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ“

”اور یقیناً ہم نے ہر امّت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔“(۱)

تاریخِ انبیاؑ اتنی ہی قدیم ہے جتنی تاریخِ بشر۔ اور یہ کہ تاریخ بشر ہمیشہ دعوت انبیاؑ کے ساتھ ساتھ رہی ہے۔ کہاں ہے یہ بات کہ پیغمبرِ خدا تو ہو مگر توحید کی دعوت نہ ہو؟ اگر مسیحیت میں تثلیث اور یہودیوں میں شرک کے مختلف انداز در آئے تو بھی ان ادیان کی بنیاد تو عقیدۂ توحید پر تھی۔ ادیانِ آسمانی کی ابتدا خدا پرستی پر تھی پھر نادان اور مال و دولت کے پجاری پیروکاروں نے ان ادیان میں کئی قسم کے بت تراشے اور [اب بھی] تراشتے ہیں۔ جیسے انسانی صورتوں کے مجسمے، مقدس چیزوں کے بت یہ معنوی پہلو سے ہے۔ کنوؤں، غاروں، پیروں کے نشانات، سقا خانے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بت کے عنوان سے بناتے ہیں۔ یا ایک طرح کے طاغوتی بت تراشتے ہیں جیسے طاغوتی امتیازات، برتری، اُسی معاشرے کے بعض قدرتمند اور ستمگر جو دین کے نام پر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

۱۔ سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۳۶

یہ فکر اس تصور کے بالکل برعکس ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ انسان نے بتوں سے خدا تک سفر کیا ہے۔ جبکہ یہاں پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کا یہ سفر خدا سے بت پرستی اور توحید سے شرک کی طرف ہوا ہے۔ پس تاریخ کے یہ دو سفر ہیں جو ایک دوسرے کے برعکس ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم انہیں مخلوط نہ کریں۔

آفتِ ذہنی

بعض لوگ اپنے مکتب، فلسفے اور کائناتی فکر کی بنیاد ایسے تاریخی سفر پر استوار کرتے ہیں کہ جو کسی خاص علاقے سے وابستہ ہوتا ہے، جیسے قدیم روم، لاطینی امریکہ یا افریقہ کے کوئی خاص علاقے، ان کا مطالعہ کرتے ہیں اور ایک تاریخی ربط و تعلق کو دریافت کرتے ہیں اور پھر اس فکر کو پوری دنیا اور انسانی تاریخ پر لاگو کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کچھ یہاں رونما ہوا ہے دیگر علاقوں میں بھی یہی تاریخی سفر وقوع پذیر ہوا۔ یہ ایسی آفت ہے جس کے لیے مستقل اور علیحدہ سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ فکری انحراف عقیدۂ خدا سے بھی مربوط ہے اور اجتماعی و معاشرتی تغیرات اور معاشرتی سفر و تحرک سے بھی مربوط ہے۔

اگر بالفرض دنیا کی بعض اقوام و ملل میں تحقیقات ہوئی ہوں اور مشاہدات سے یہ بات سامنے آئی ہو کہ تمام انسانی معاشروں میں دورِ قدیم مشترک صفات کا مالک ہے، مثلاً پہلے غلامی کا دور رہا پھر اس کے بعد فیوڈل ازم پھر کیپٹل ازم اور اسی طرح مختلف ادوار گزرتے رہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا تاریخ کے اعتبار سے تمام اقوام و ملل میں مشترکہ طور پر اولین دور ضروری ہے کہ غلامی کا ہی دور ہو؟ کیا تمام اقوام و ملل میں یہ تحقیق کر لی گئی ہے؟ اور بغیر کسی وقفے کے بالترتیب یہ پانچ مراحل پائے گئے ہیں؟ ابھی ہم اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے لیکن یہ بات یاد رہے کہ یہ ایک مشکل ہے۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ

مزے کی بات یہ ہے کہ جو دوسروں کو آئیڈیل ازم اور خیال و وھم کے معتقد ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اگر بغور ملاحظہ کیا جائے تو یہ خود ہی اپنے مکتب کی بنیاد انہی تصورات اور توہمات پر استوار کرتے ہیں۔

۳۔ طاغوت اور امراء کے مد مقابل انبیاؑ

دوسرا مسئلہ جس میں ان کا کہنا یہ ہے کہ دین امراء و صاحبان حل و عقد کی پیداوار ہے۔ سوال یہ ہے کہ دین سرداروں کی ایجاد ہے، طاغوت و ستم گروں کی پیداوار ہے یا ان کے مدِ مقابل ہے۔ وہی آیت جو ابھی بیان کی گئی ہے جس میں ارشاد ہو رہا ہے کہ ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے جس کی دعوت دو نقطوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ خدا ہے اور دوسرا یہ کہ طاغوت اور ستم گروں کا مقابلہ، خدا کی عبادت کرو اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو اور طاغوت کا مقابلہ کرو۔ مختصر یہ کہ انبیاؑ کی دعوت کا نچوڑ یہی دو کلمے ہیں۔

”لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ“

”یقیناً ہم نے اپنے رسولوںؑ کو کھلی ہوئی دلیلوں (معجزوں) کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں۔“(۱)

انبیاؑ آئے، کتاب، میزان اور ثقافت کے ساتھ آئے تا کہ لوگ عدالت قائم کریں۔ پیغمبروں کا ہدف اور ان کی دعوت عدل و قسط کا قیام ہے۔

”وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ۔“

۱۔ سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۲۵

''اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کو زمین میں کمزور بنا دیا گیا ہے ان پر احسان کریں اور انہیں لوگوں کا پیشوا بنائیں اور زمین کا وارث قرار دیدیں۔''(۱)

ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم محروم و مستضعف افراد کو بال و پر عطا کریں اور انہیں حاکم و وارث بنائیں تا کہ محرومین و مستضعفین اپنی تقدیر کے خود ذمہ دار ہوں۔ جو امامت' رہبریت' حاکمیت' وراثت اور اموال ان سے چھینے گئے ہیں پھر ان کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اس لیے آئے ہیں تا کہ کمزور و ناتواں افراد کو تحفظ فراہم کیا جا سکے اور وہ بھی اچھی زندگی گزار سکیں۔ اگر آپ لوگ حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت نوحؑ' حضرت شعیبؑ اور دیگر انبیاؑ کی دعوت پر غور کریں تو سب کی دعوت میں یہی ہدف مشترک نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو قرآن نے یوں نقل کیا ہے۔

''اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى''

''تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی سے بات کرنا کہ شاید وہ نصیحت قبول کر لے یا خوف زدہ ہو جائے۔''(۲)

فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی اختیار کر لی ہے اس سے بڑے نرم لہجے میں بات کرو تا کہ اس خوابِ غفلت سے بیدار ہو اور اس غرور و تکبر کی وادی سے نکل آئے اور خدا کو یاد کرے یا خدا سے ڈرے۔

۱۔ سورۂ قصص ۲۸۔ آیت ۵

۲۔ سورۂ طہٰ ۲۰۔ آیات ۴۳' ۴۴

"فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ، وَلَا تُعَذِّبْهُمْ، قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكَ، وَالسَّلَامُ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ۔"

"فرعون کے پاس جاکر کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں بنی اسرائیل کو ہمارے حوالے کردے اور ان پر عذاب نہ کر کہ ہم تیرے پاس تیرے پروردگار کی نشانی لے کر آئے ہیں اور ہمارا سلام ہو اس پر جو ہدایت کا اتباع کرے"۔(۱)

فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم تیرے پروردگار کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں تم نے ان لوگوں کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر رکھا ہے اور یہ محروم ہو گئے ہیں ان کو آزاد کر دے اور ہمارے ساتھ بھیج دے ان کو اذیت نہ دے۔ ہم تمہارے لیے پروردگار کی طرف سے نشانیاں لائے ہیں اور درود و سلام ہو ان پر جو ہدایت کی پیروی کرتے ہیں۔

"ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ وَأَخَاهُ هَارُونَ، بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُبِينٍ۔ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ۔ فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ۔"

"پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ۔ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ لوگ بڑے سرکش لوگ تھے۔ چنانچہ وہ کہنے لگے کہ ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لائیں حالانکہ ان کی قوم ہماری خدمت گزار ہے۔"(۲)

۱۔ سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۴۷

۲۔ سورۂ مومنون ۲۳۔ آیات ۴۵، ۴۶، ۴۷

ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنی نشانیوں اور حجتِ قاطع کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا اس لیے کہ انہوں نے تکبر کیا اور بڑے بن بیٹھے۔ یہ لوگ قدرت واقتدار کے طلبگار اور جاہ وحشم چاہتے تھے پس انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم اپنے جیسے دو افراد پر کیسے ایمان لے آئیں حالانکہ ان کے ماننے والے ہماری ہی قوم کے اور ہمارے ہی غلام ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ کون مستکبرین اور سرکشوں کے سامنے کھڑا ہوا؟ کس نے فرعون اور اس کے درباریوں اور غلام بنانے والوں کے مقابل قیام کیا؟ وہ موسیٰؑ ہیں' دعوتِ خدا اور ہدایتِ الٰہی ہے جس نے ان کا مقابلہ کیا۔ اب بتائیں کہ دین سرداروں اور سرکشوں نے گھڑا ہے یا بالکل ان کے مقابل میں ہے؟

"فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ط وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ۔"

"سو جب وہ ہماری طرف سے حق لے کر ان کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر دو اور ان کی عورتوں (لڑکیوں) کو زندہ چھوڑ دو۔ اور کافروں کی (ہر) تدبیر گمراہی میں (رائیگاں) ہے۔" (۱)

جب وہ ہماری طرف سے حق ان کے لیے لائے تو انہوں نے کہا کہ جو ایمان لائے ان کے بیٹوں کو قتل کر دو اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو (۲) پس کافروں کا مکروفریب سوائے

۱۔ سورۂ مومن ۴۰۔ آیت ۲۵

۲۔ اب یہ شاید اس وجہ سے ہے کہ نسل ہی ختم ہو جائے یا یہ کہ دوسروں کے استفادہ کے لیے باقی رہے یا فساد کا مقدمہ ثابت ہو یا شاید لڑکے اور مرد اس دور میں طاقت کی علامت تھے۔ بہر حال جو بھی دلیل تھی۔

ضلالت وگمراہی کے کچھ نہیں یعنی خدا آخر کار ان کے مکروفریب اور ان کی سازشوں کو برباد کردے گا۔لیکن فرعون نے کیا کہا؟

"وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ۔"

"اور فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو۔ میں موسیٰ (ع) کو قتل کردوں اور وہ (اپنی مدد کیلئے) اپنے پرورگار کو پکارے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کہیں تمہارا دین (شرک) نہ بدل دے۔یا زمین میں فساد برپا نہ کردے۔"(۱)

فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰ کو قتل کروں گا اور وہ جو دعائے خیر یا بددعا کرنا چاہے کرلے۔میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ وہ تمہارا دین نہ بدل ڈالے۔انہوں نے معاشرتی رسم ورواج کے خلاف اور تمہاری ثقافت اور جن سے تم نے کچھ حاصل کیا ہے ان کے خلاف قیام کیا ہے۔میں ڈرتا ہوں کہ وہ فساد برپا کرے گا اور آپس میں لڑوائے گا۔

ملاحظہ فرمائیں کہ مصلحین کے مقابلے میں طاغوتوں اور سرکش دشمنوں کا رویہ اس طرح کا ہوتا ہے۔یہ آیت بھی بڑی دلچسپ ہے۔

"وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ"

"اور ہم نے جب بھی کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا (نبیؐ) بھیجا تو وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے یہی کہا کہ جس (دین) کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔"(۲)

۱۔سورۂ مومن ۴۰۔آیت ۲۶

۲۔سورۂ سبا ۳۴۔آیت ۳۴

پس مراعات یافتہ طبقہ (مترف)، طاغوت، ظالم وستمگر، مستکبرین اور ان جیسے دیگر سب انبیا کے مخالف تھے۔

توحیدی ادیان کی راہوں کو منحرف کرنا

توحیدی ادیان ہی مراعات یافتہ طبقے، طاغوت وسرکش لوگوں، ظالم وستمگر، راحت و آسائش میں پلنے والوں کے خلاف معرکہ آرا ہیں۔ جس طرح اصلی اور حقیقی دین میں شرک شامل ہو گیا اسی طرح ادیان الٰہی اور اسلام ان سرکشوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ کتنی ہی ایسی روایات بنی امیہ نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے گھڑیں، کتنے ہی ایسے مذہبی راہنماؤں نے ان حکومتوں سے نان ونفقہ حاصل کیا اور مسلمانوں کے بیت المال سے استفادہ کیا حالانکہ وہ ان حکومتوں کے اشاروں پر چلنے والے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ لوگوں کو اپنی افتراء پردازی اور جعل سازی سے دھوکہ دیں اور ان کو جاہل ہی رکھیں۔

ہماری کتب تاریخ اور روایات و احادیث میں دشمنوں کی دست اندازی اتنی زیادہ ہے کہ اب حقیقی اسلام کو سمجھنے کے لیے تحقیقات اور تنقیدی جائزہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ تفسیر کا میدان ہو یا آیاتِ الٰہی کے دیگر مفاہیم کا مسئلہ ہو۔ جہاں بھی کسی مفسر نے سرور کائناتؐ اور امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ سے تفسیر بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس کا راستہ روکا گیا ہے۔

میں نے ایک بات دیکھی ہے کہ معاویہ نے بعض قاریانِ قرآن اور پیغمبر اکرمؐ کے خاص اور مشہور صحابہ کو کہا کہ میں نے سنا کہ تم قرآن پڑھتے ہو اور تفسیر کرتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ پھر کیا کریں؟ قرآن پڑھیں اور تفسیر نہ کریں؟ معاویہ نے کہا کہ قرآن پڑھو لیکن اس کی تفسیر اور تشریح نہ کہو۔ مفاہیم آیات بیان نہ کرو، انہیں واضح تر نہ کرو، اگر کرنے بھی ہوں تو جس طرح ہم چاہتے ہیں ویسے کرو۔

اس طرح غلط استفادہ قرآن سے ہوا ہے‘ خدا‘ انبیاؑ و پیغمبر اکرمؐ آئمہ طاہرینؑ بالخصوص امام حسینؑ اور امام زمانہؑ اور دین کی دیگر مقدس تعلیمات کے حوالے سے ہوا ہے۔ جس کی وجوہات بعض اوقات جہالت و نادانی‘ عوام زدگی وغیرہ تھی اور اکثر اوقات مالی منفعتوں کے حصول وغیرہ کی غرض سے ایسا کیا گیا ہے۔ پس جو کچھ ادیان بالخصوص اسلام پر گزری ہے اور اسلامی تعلیمات کو جس انداز سے غلط درک کیا گیا ہے اور تاریخ کو پائمال کیا گیا ہے اسی وجہ سے ایک اہم اور عظیم ذمہ داری کا بوجھ کاندھوں پر آن پڑا۔

تجدیدِ دینی

ہمارا مقصد دین میں رخنہ اندازی یا نیا دین ایجاد کرنا نہیں بلکہ حقیقی اسلام کی تعلیمات کا احیا ہے۔ تعلیمات قرآن اور روایات میں کسی اضافے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ ہم تاریخ کے مختلف ادوار میں ان تعلیمات پر چڑھنے والے رنگ کو اتاریں‘ اس آلودگی کو اتاریں اور ان پر پڑے ہوئے حجابوں کو ہٹائیں۔

معترضین کا کہنا ہے کہ بعض لوگوں نے تمہیں غفلت کی نیند سلانے کے لیے تمہاری دعاؤں سے استفادہ کیا ہے۔ پس آپ کی یہ دعائیں ان لوگوں کی ایجاد ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ امام سجادؑ کی دعائیں تو انسانوں کو بیدار کرنے والی اور آفاقی سوچ کی مالک ہیں‘ حقائق کو واضح و روشن کرنے والی ہیں۔

قرآنی ادعیہ اجتماعی بنیادی مسائل سے مربوط ہیں۔ افراد کے آپس کے روابط اور قوموں کے ربط و تعلق سے متعلق ہیں‘ فضائل و کمالات اور اچھائیوں کی آئینہ گر ہیں۔ اب اگر ان قیمتی اساسوں اور خاندانِ وحی کے عظیم راہنما اصولوں سے کوئی غلط استفادہ کرے اور فقط زبان تک محدود کرے اور ان کی حقیقی روح کی طرف توجہ نہ دیں تو اس کا نتیجہ یہ تو نہیں نکلتا کہ یہ سب کچھ استعمار کی پیداوار ہے اور سرداروں کے منافع کی وجہ سے وجود میں آیا

ہے۔ اس کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں کہ یہ ایک قیمتی گوہر ہے جو نااہل افراد کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے یا یہ تیز دھار والی تیغ کی مثل ہے کہ جو ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے جس کے ذریعے وہ اچھے افراد کے خلاف معرکہ آرائی کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ دین سرداروں اور جاگیرداروں کی پیداوار ہے انہیں چاہیے کہ وہ یہ کہیں کہ دین چند ایمان فروشوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہے۔ صحیح ہدف و مقصد جو دین چاہتا ہے اس کو زندہ کیا جائے اور اسی کو عملی شکل میں لایا جائے۔

۴۔ دو جہتی اور آزاد انسان

آخر میں اس طرف اشارہ کر دوں کہ بعض کا کہنا ہے کہ معاشی' اعتقادی اور معنوی مسائل دراصل پیداواری روابط پر مبنی ہیں۔

نظریے کی تحلیل اس طرح ہے کہ وہ انسان کو ایک مادی اور طبیعی موجود دیکھتا ہے۔ جس نے خاک کے بستر سے اٹھ کر حیوانات کے درمیان سے تکاملِ حیات کے لیے سر اٹھایا پھر معاشرے کا محکوم و مجبور ہوا اور پھر اسی کے دامن میں غرق ہو گیا۔ اس طرح اس نے معاشرے کی تاریخ اور مالی و اقتصادی روابط کو بھی رقم کیا' جو خود ایک طرح کا جبر ہے لیکن جسے بہر حال پیش آنا ہی تھا اور پیش آیا بھی ہے۔ بنا بریں انسان بندھے ہاتھ پیروں کے ساتھ تاریخ کے دھارے پر محکوم و مجبور ہے۔

ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ دونوں موارد قابلِ بحث ہیں۔ اولاً انسان خاک سے تشکیل پایا ہے لیکن خدا نے اپنے رزق سے اسے بال و پر عطا کیے اور آزاد بنایا ہے۔ بنا بریں انسان کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے کہ ہم اسے ایک پہلو سے فقط مادی و خاکی و علاقائی نہیں دیکھتے ہیں بلکہ ہم اسے ملکوتی بھی سمجھتے ہیں' روحِ مطلق کو انسان کے اندر منعکس و مجسم جانتے ہیں۔ انسان "اِلَى اللهِ الْمَصِيْرُ" "فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ" "اِنَّكَ

كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَٰقِيهِ '' إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ '' اور '' وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي '' کی حالت میں ہے۔(۱) یہ حالت انسان کو نیا رخ عطا کرتی ہے۔لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ اس پہلو کے ثابت ہونے سے انسانی ذہن اور روح کے اندر معنوی و معاشرتی مسائل اور ادیان یہاں تک کہ ہنری مسائل وغیرہ بھی انسان کے خاکی وطبیعی پہلو کے پابند نہیں رہتے بلکہ اسکے الٰہی وملکوتی پہلو سے مربوط ہوتے ہیں۔جو بھی ایک مادی و خاکی محدود نظریہ کا پابند ہے وہ تمام ثقافت' ہنر' ادبیات' فلسفہ' مذہب' معنویت' عرفان وغیرہ کو فطرت اور مادے کا انعکاس (reflection) جاننے پر مجبور ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ انسان ایک مادی وطبیعی حالت رکھتا ہے اور ایک الٰہی حالت بھی۔ لہٰذا ابتدا ہی سے معاشرہ' ادبیات اور ہنر کی بنیادیں' معنوی' عرفانی اور فکری مسائل' ایجاد' تخلیق' وغیرہ انسان کے اندر اور اسکی ذات میں موجود ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ وہ پہلے خاک وفطرت کی جانب نگاہ کرے اور اقتصادی و مالی روابط کو دیکھے پھر اسکے بعد اپنے لیے معاشرہ وادبیات وفلسفہ بنائے' بلکہ فکر' ثقافت' ادبیات' عرفان فلسفہ انسان کے اندر سے سر اٹھاتا ہے۔

یقیناً پیداواری و اقتصادی و اجتماعی روابط اثر انداز ہوتے ہیں اور انسان کے مختلف پہلو آپس میں مربوط ہیں۔شہوت پرستی' مال پرستی' اور مقام ومنصب سے محبت یہ سب کمال طلبی اور خیر طلبی سے زور آزما ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اقتصادی و اجتماعی روابط بھی انسان کی ثقافت اور افکار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن سرچشمہ و بنیاد کبھی مادی روابط و پیداواری وسائل ہوتے ہیں اور کبھی ہم کہتے ہیں

۱۔انسان کے ملکوتی پہلو کے بارے میں قرآنِ کریم کی مختلف تعبیرات۔سورۂ آل عمران ۳۔آیت ۲۸' سورۂ نحل ۱۶۔آیت ۳۶' سورۂ انشقاق ۸۴۔آیت ۶' سورہ بقرہ ۲۔آیت ۱۵۶' سورۂ حجر ۱۵۔آیت ۲۹ (د)

موجود ہو۔

بنابریں ہم فطرت و پیداواری روابط کے نظام کو انسان کے مجبور ہونے کے عنوان سے نفی بھی کر رہے ہیں (وہ عوامل مؤثر ہیں لیکن انسان مجبور نہیں ہے) اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ضروری ہے انسان صرف ایک جاذبہ اور ایک مادہ اور ایک معاشرہ فطرت کے نام پر رکھتا ہو۔ ہم قرآنی کلام کی بنیاد پر جو اس نے ہمیں سکھایا بیدار ملکوتی انسان کے معترف ہیں۔

وحی بیدار کرنے والی ہے

وحی دراصل انسان کی عقل سے کہیں بالاتر ہے یعنی انسان نے اپنی ذہنی، عقلی، فکری اور فلسفی تحرک سے وحی کو حاصل نہیں کیا ہے بلکہ ادیانِ الٰہی اوپر سے اور خدا کی جانب سے انسان کو وحی کیے گئے ہیں۔ یہ انسان کا اپنا تکاملی تحرک نہیں تھا کہ جس کی بنا پر اس نے رفتہ رفتہ اندر سے مسائل کو کشف کیا' بلکہ یہ اسے باہر سے الہام ہوئے ہیں۔ لہٰذا وحی کو ایک طرح سے اندر کشف نہیں کیا ہے بلکہ باہر سے بنی بنائی چیز پر اس پر لاگو کی گئی ہے یعنی یہ خودساختہ نہیں ہے۔ یعنی خداوندِ حکیم نے حالات کی مناسبت سے ایک مناسب فرد کو منتخب کیا اور اسے لوگوں کی ہدایت کے لیے الہام عطا کیا۔

چھٹا راستہ

اسلامی اور غیر اسلامی معاشرے
کے حالات کا عینی مطالعہ وموازنہ

"وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ"

"اور اگر اسی طرح خدا بعض کو بعض سے نہ روکتا رہتا تو ساری زمین میں فساد پھیل جاتا۔"(۱)

ملحدین اور مادہ پرستوں کا آخری اعتراض یہ ہے کہ اسلامی ممالک اور وسیع تر عبارت میں وہ ممالک جن میں کسی بھی انداز میں عقیدۂ خدا موجود ہے' وہاں لوگوں کی صورتِ حال اچھی نہیں۔ اور علمی و صنعتی ترقی اور اجتماعی و ثقافتی لحاظ سے پیش رفت کا دنیا میں اسلامی ممالک اور غیر اسلامی ممالک کا موازنہ کیا جائے تو اسلامی ممالک انحطاط کا شکار ہیں' اس ترقی کی دوڑ میں پیچھے ہیں جس کی بنیادی وجہ خدا کا عقیدہ ہے اور اگر محدود کریں تو ایسا اسلام کو ماننے کی وجہ سے ہے۔

یہی بات بعض اوقات ایک دوسرے انداز میں بیان کی جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کئی مکاتبِ فکر ایسے بھی موجود ہیں کہ جن کی بنیاد ہی خدا کے انکار پر ہے لیکن ان میں اجتماعی اور اقتصادی و معاشی قوانین پائے جاتے ہیں۔ ان مکاتبِ فکر کا معاشرے میں کردار اور اجتماعی حوالے سے ان کے ذریعے ہونے والی تبدیلیوں بالخصوص جو اس آخری دور میں

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۱

وقوع پذیر ہوئی ہیں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جو مکاتب خدا کے منکر ہیں وہ عظیم تبدیلیوں کا باعث بنے ہیں اور علمی و صنعتی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس وہ ممالک جن میں چند صدیوں سے یا بعض اوقات چند ہزار سالوں سے دینی رجحانات پائے جاتے ہیں وہ ابھی تک بھی ہر میدان میں پیچھے ہیں۔ پس اس عینی مشاہدے کے بعد بھی کیا عقیدۂ خدا اور دین و مذہب کی طرف میلان کی کوئی صورت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا پھر بھی ہم اس بات کا عقیدہ رکھیں کہ آسمانی مذاہب بالخصوص اسلام ایسا مکتب ہے جو نجات بخش ہے، معاشرے کو آگے بڑھنے اور اس میں ترقی اور رشد کا ضامن ہے اور لوگوں کو فعال بناتا ہے؟

یہی بات کچھ افراد کے ملحد ہونے کا باعث بنی ہے۔ اور وہ لوگ بھی کم نہیں جو اسی بات کو دلیل بنا کر طرفِ مقابل کو زیر کرتے ہیں اور الٰہی مکاتب کو داغ دار کرنے اور خدا اور دین کی طرف میلان رکھنے والوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ یعنی اگر ان کے مشاہدات نہ بھی ہوں پھر بھی استدلال ضرور کرتے ہیں اور اس بات کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور اس کو اپنے سہارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

حسبِ سابق اس بحث کا بھی تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ عینی مشاہدات ممکن ہیں اور یہ الحاد کی طرف انسان کو لے جاتے ہیں یا ایسا نہیں ہے؟

الف: قضاوت کی بنیاد کا غلط ہونا

سب سے پہلی بات تو یہ کہ اگر ہم بھی اسلامی ممالک اور اسلامی معاشروں کا عینی مشاہدہ کرتے تو یہ کسی حد تک ہمارے لیے بھی الحاد کی طرف مائل ہونے میں مددگار ثابت ہوتا یعنی اگر ہم فقط اسلامی ممالک کی اجتماعی صورت حال کا مطالعہ کریں اور موازنہ کریں اور اس مطالعے میں کوئی اور چیز پیشِ نظر نہ ہو اس طرح کا فیصلہ کرنے میں کسی اور چیز کا مطالعہ نہ

ہو تو یہ بات ہمارے ملحد ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی شخص یہ دیکھتا ہے کہ اخلاقی لحاظ سے یہ معاشرے بے راہ روی کا شکار ہیں۔ اجتماعی و معاشرتی روابط کی کیفیت ناگفتہ بہ ہے، عدل وانصاف کو پائمال کیا جاتا ہے، ظلم وستم اور بے عدالتی عام ہے۔ طبقاتی اختلاف اور برائیاں اپنے عروج پر ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ صنعتی اور ثقافتی لحاظ سے پیچھے ہیں اور زندگی کی گاڑی رواں رکھنے کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں، تو یقیناً وہ یہی فیصلہ کرے گا کہ جو مکتب اس معاشرے کو چلا رہا ہے وہ انتہائی فرسودہ اور کمزور ہے اور قابل پیروی نہیں۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور ان کے اعمال وکردار کسی ایسے شخص کو جو خود مکتب سے ناآشنا ہے یہ موقع ہی فراہم نہیں کرتے کہ وہ اس مکتب کے بارے میں کوئی اچھا اور درست فیصلہ کر سکے۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اس طرح فیصلہ کرے اس لیے کہ یہ معاشرہ دین اور اپنے مکتب سے راہنمائی لیتا ہے اور چونکہ معاشرہ انحطاط اور پستی کی راہ پر گامزن ہے تو یقیناً اس کا مکتب بھی پست اور زوال پذیر ہے۔

نتیجے کے طور پر ایک نکتہ یہ کہ کیا کسی ایک معاشرے کا صرف مطالعہ کافی ہے؟ کیا کسی معاشرے کے رسمی دین سے اس معاشرے کی حقیقت وعینیت کی تفسیر ہو سکتی ہے؟ یا مذہب کو کسی اور شکل میں دیکھنے اور تفسیر کرنے کی ضرورت ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت واضح اور روشن غلطی ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے سب سے پہلے اس بات کو مسلّم سمجھ لیا ہے کہ اسلام کا نمونہ اسلامی ممالک اور ان میں بسنے والے لوگ ہیں کہ جن کے شناختی کارڈ پر مذہب کے خانے میں مسلمان لکھا ہوا ہے۔ اور آ کر فیصلہ صادر کر دیا حالانکہ قضاوت کا یہ طریقہ ہی غلط ہے۔ اور نہ ہی یہ مطالعے کا انداز درست ہے۔ اسلام کو خود اسلام میں سمجھا جانا چاہیے اس کے اصلی وحقیقی منابع کا مطالعہ کرنا چاہیے پھر قضاوت کرنی چاہیے نہ اس معاشرے کے ذریعے سے جس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اور اپنی ظاہری شکل وصورت مسلمانوں والی بنالی ہے۔ بقول سید

جمال الدین افغانی: ''الاسلام محجوب بالمسلمین'' (اسلام کا حقیقی چہرہ مسلمانوں کے اعمال کے پردوں میں چھپ گیا ہے۔) یہ اس مسئلے کا پہلا حصہ تھا جس پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی اس بات پر اعتراض کرے اور کہے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات ہیں۔ پس اس مکتب کی تعلیمات ہی اس قدر ناقص ہیں کہ جس طرح معاشرے کو بنانا چاہیے تھا بن نہیں سکا۔ آخر یہ مکتب اس معاشرے میں آیا ہے ایک عرصے اس معاشرے میں رہا ہے اور اب آپ کہتے ہیں کہ اس معاشرے کا مکتب و قرآن سے کوئی واسطہ و تعلق نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اس مکتب میں اتنی قوت نہیں کہ ایک معاشرہ تشکیل دے سکے اور اسے چلا سکے۔ اب ایک ایسے مکتب اور قانون کی تلاش میں ہے جو اتنی قوت رکھتا ہو کہ معاشروں کی تشکیل کر سکے۔

ب۔ تاریخ ساز سنتوں کا وجود

یہاں ہم مجبور ہیں کہ واپس پلٹیں اور اپنے اصلی ترین مطلب پر کام کریں اور بحث کریں۔ اسلام میں اور آیاتِ قرآنی میں کچھ ایسے قوانین ذکر کیے گئے ہیں جو تاریخ ساز اور اہم تبدیلیوں کا باعث ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام فلسفہ و قوانین کی تاریخ سے لاتعلق نہیں بلکہ تاریخ کی وضاحت کے لیے قوانین موجود ہیں۔ البتہ یہ توقع نہ رکھیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں جو تاریخ کے حوالے سے قوانین ہیں ان کو مکمل طور پر بیان کریں گے۔ ہم یہاں پر اجمالی طور پر یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ یہ اسلام فلسفۂ تاریخ سے لاتعلق نہیں بلکہ اس بات کا معتقد ہے کہ کچھ اصول و قوانین ہیں جو تاریخ بناتے ہیں اور اس میں تبدیلی لاتے ہیں۔ کسی قوم کا عروج و زوال قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ اور یہ قوانینِ تاریخ بھی کائنات پر حاکم قوانین کی طرح قاطعیت رکھتے ہیں کئی

مقامات پر قرآن بیان کرتا ہے کہ:

"فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا"۔

"اور خدا کا طریقہ کار بھی نہ بدلنے والا ہے اور نہ اس میں کسی طرح کا تغیر ہوسکتا ہے۔"(۱)

قانونِ خدا تبدیل ہونے والا اور تبدیلی قبول کرنے والا نہیں ہے یہ بات وہاں بیان ہوئی ہے جہاں تاریخ کے قوانین کا تذکرہ ہے یعنی آیات کا سیاق ان قوانین اور تبدیلیوں کو بیان نہیں کر رہا کہ جو کائنات میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ بلکہ اقوام وملل کے عروج وزوال کی بات ہو رہی تھی اور ان کے بعد فرمایا کہ کچھ قوانین ایسے ہیں جو خدا نے قوموں کے لیے بنائے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ ہم بطور نمونہ چند آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ا۔ ظالم وفاسد کی ہلاکت

سورۂ یونس میں ارشادِ ربُّ العزت ہے کہ:

"وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ"۔

"یقیناً ہم نے تم سے پہلے والی امتوں کو ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کیا اور ہمارے پیغمبر ہماری نشانیاں لے کر آئے تو وہ ایمان نہ لا سکے۔ ہم اسی

ا۔ سورۂ فاطر ۳۵۔ آیت ۴۳

طرح مجرم قوم کو سزا دیتے ہیں۔اس کے بعد ہم نے تم کو روئے زمین پر ان کا جانشین بنادیا تاکہ دیکھیں کہ اب تم کیسے اعمال کرتے ہو۔"(۱)

ہم نے تم سے پہلے والے لوگوں کو ہلاک کردیا اس لیے کہ وہ ظالم تھے یعنی اس معاشرے میں اجتماعی روابط کی بنیاد عدالت پر نہ تھی اور اختلافات، قتل و غارت گری اور ظلم و تعدی عام تھی پس ظلم و ستم جب معاشرے کو گھیر لیتا ہے معاشرے کی تاریخ ظلم و ناانصافی کی روشنائی سے لکھی جاتی ہے تو تباہی اس قوم کا مقدر بن جاتی ہے۔پس ظلم تاریخ رقم کرتا تھا زوال اور ہلاکت کی تاریخ نہ کہ عروج و سربلندی کی۔

اس کے بعد انبیاؑ کا سلسلہ جاری رہا اور وہ آیاتِ الٰہی اور دلیل و برہان لائے تاکہ لوگوں کی ہدایت کریں لیکن لوگ ایمان نہ لائے اور دعوتِ انبیاؑ کو قبول نہ کیا تو خدا نے فرمایا ہم اس طرح مجرم لوگوں کو سزا دیتے ہیں۔اس کے بعد آیت کے ذیل میں ایک دلچسپ بات بیان ہوئی ہے کہ اے مسلمانو اور اے امتِ مسلمہ! ہم نے تمہیں گزشتہ امتوں کا جانشین قرار دیا تاکہ آزمائیں کہ تم کیسے اعمال انجام دیتے ہو۔بہت ساری قومیں ملیامیٹ ہوگئیں اور امتِ مسلمہ ان کی جانشین قرار پائی۔مکتب اور دین عظیم نظام لے کر آیا ہے اور مینارۂ نور بن کر اور عظیم قوتوں کے ساتھ آیا ہے جس نے ان قوموں کو ہلاکت کی وادی میں دھکیل دیا جو اپنے ظلم و فساد کی وجہ سے تباہی کے دہانے پر کھڑی تھیں اور ایک نیا معاشرہ نئی امت کے ساتھ تشکیل دیتا ہے، تاریخ کا ایک نیا باب رقم کرتا ہے تاکہ اس امت کا امتحان ہو سکے۔اب دین و مکتب کی تعلیمات کی مدد سے اجتماعی ماحول سازگار ہونے لگا ہے اور نئے انقلاب کی شرائط پورا ہوا چاہتی ہیں اور تاریخ میں تم نے ایک خاص مقام حاصل کرلیا ہے اور تاریخ کو حرکت میں لے آئے تو اب یہ گمان و خیال نہ کرو کہ تم ہر دلعزیز قوم بن گئے

۱۔سورۂ یونس ۱۰۔آیات ۱۳، ۱۴

ہواور پوری دنیا پر تمہارا راج ہے اور تاریخ کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ آ گئی ہے۔ ایسا نہیں بلکہ "لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ" تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے اعمال انجام دیتے ہو۔ تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو اور تمہارا رابطہ اس مکتب و دین سے کتنا مضبوط ہے جس نے تمہیں اس مقام پر لا کھڑا کیا اور ظالموں کو تباہ و برباد کر ڈالا؟ اب کیا تم اس نظام اور اس کی تعلیمات کی حفاظت کرتے ہو یا چھوڑ رہے ہو اور ظلم و ستم کی وادی میں جا گرے ہو اور ہلاکت و بربادی کو سینے سے لگا لیا ہے؟ ایک اور مقام پر چند آیات کے ذیل میں فرمایا:

"اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ۔"

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا ہے"

"اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ۔"

"ستون والے ارم والے"

"الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ۔"

"جس کا مثل دوسرے شہروں میں نہیں پیدا ہوا ہے"

"وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ۔"

"اور ثمود کے ساتھ جو وادی میں پتھر تراش کر مکان بناتے تھے"

"وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ۔"

"اور میخوں والے فرعون کے ساتھ"

"الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ"

"جن لوگوں نے شہروں میں سرکشی پھیلائی"

"فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ۔"

"اور خوب فساد کیا"

"فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ۔"

تو پھر خدا نے ان پر عذاب کے کوڑے برسا دیئے

''اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ۔''

''بے شک تمہارا پروردگار ظالموں کی تاک میں ہے۔''(۱)

کیا تم دیکھتے نہیں ہو' مطالعہ نہیں کرتے ہو کہ خدا نے قومِ عاد کے ساتھ کیا کیا؟ جو بلند و بالا ستونوں والے یا بڑے بڑے محلّات والے بڑے بڑے قلعوں والے تھے۔

لیکن یہ لوگ ظالم تھے اور فساد برپا کرتے تھے اور یوں طغیان و سرکشی' ظلم و ستم' دوسروں کے حقوق کی پائمالی' طبقاتی اختلافات' قتل و غارت گری' اضطراب و پریشان حالی اور دھونس و دھمکی میں اضافہ ہو گیا۔ پس جب سرکشی' غارت گری دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ اور زور و زبردستی شروع ہو جائیں تو ماحول فاسد ہو جاتا ہے' جب جنسی بے راہ روی' اخلاقی مفاسد' رشوت خوری' جھوٹ' بے اعتمادی' فریب و دھوکہ دہی' دوسروں کے حقوق کی پائمالی جیسے مفاسد اور اسی طرح شراب' زنا' جوا اور ان جیسے دیگر گناہ ماحول کو آلودہ کر دیں تو بیمار افراد ایسے ماحول میں سرکشوں کی چراگاہ بن جاتے ہیں۔

اس صورت حال میں عذابِ الٰہی نازل ہوتا ہے عذاب یعنی پیچھے رہ جانا' انحطاط' پستی' ذلت' جنگ وغیرہ۔ یہ عذاب جہنم کا نہیں' یہاں عذاب یہ ہے کہ اس دنیا میں لوگ برائیوں میں مبتلا ہو جائیں۔

پھر فرماتے ہیں۔ خدا ایسے لوگوں کی تاک میں ہے الٰہی قوانین تاریخ کی تاک میں ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ تاریخ میں بڑی قاطعیت سے اپنا فرمان جاری کریں اور تاریخ میں ہونے والے تحولات کو اپنے کنٹرول میں لیں۔ خدا کہنا چاہتا ہے کہ ظلم و فساد اور سرکشی کا تباہی اور بربادی اور ہلاکت کے ساتھ گہرا تعلق ہے' یعنی فساد و سرکشی زوال اور تباہی و

۱۔ سورۂ فجر ۸۹۔ آیات ۶ تا ۱۴۔

بربادی کے لحاظ سے منفی معنوں میں تاریخ رقم کرتے ہیں۔

۲۔متمول معاشرے کی ہلاکت

''وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا''

''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو ہم وہاں کے خوشحال لوگوں کو (انبیاؑ کے ذریعہ سے اپنی اطاعت کا) حکم دیتے ہیں اور وہ (اطاعت کی بجائے) نافرمانی کرنے لگتے ہیں تب اس پر (عذاب کی) بات ثابت ہو جاتی ہے اور ہم اسے تباہ و برباد کردیتے ہیں۔''(۱)

اور جب ہم کسی بستی کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاکت میں ڈالتے ہیں تو اس کے پیشواؤں اور عیش پرستوں کو اطاعت کا حکم دیتے ہیں لیکن وہ تو اس بستی میں فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں اور لوگ بھی ان کی پیروی کرتے ہیں، تب اس بستی پر عذاب کا فیصلہ لازم ہو جاتا ہے پھر ہم اسے پوری طرح بدکاری کے جرم کی وجہ سے تباہ کردیتے ہیں۔

کسی بھی بستی کی ہلاکت کی ایک بنیادی وجہ وہاں کے عیش پرست لوگوں کا آگے آجانا ہے۔

مترف سے مراد عیش پرست اور خوشحال لوگ کہ جو مختلف حیلے بہانوں سے مال و دولت اکھٹا کرتے ہیں اور بے جا اخراجات کرتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ حرام و ناحق ہے یا نہیں۔ مال و دولت کے حصول اور اسے خرچ کرنے کی خاطر سرکشی کرتے ہیں اور پروا بھی نہیں کرتے شاید یہ معنی مترف کے اصلی معنی کے قریب تر ہے۔ جب عیش پرست اور خوشحال لوگ کسی معاشرے میں قدم رکھتے ہیں اور فسق و فجور کرتے ہیں اور برائیاں عام

۱۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۱۶

کرتے ہیں گناہوں کی ترویج کرتے ہیں تو نتیجے کے طور پر امرِ الٰہی اس معاشرے کے لیے ثابت ولازم ہوجاتا ہے یہ کہ اس بستی اور اس معاشرے کو تباہ وبرباد اور ویران کر دیا جائے۔ پس یہ مترفین (عیش پرست) کسی قوم کی سرنوشت میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جس معاشرے میں یہ قدم رکھتے ہیں وہ تباہ وبرباد ہوجاتا ہے۔

اسی حوالے سے چند آیات اکھٹی کی ہیں لیکن ان سب کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں البتہ چندوہ آیات جوان قوانین پر مشتمل ہیں جو قوم یا معاشرے پر حاکم ہیں ان میں سے چند کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

۳۔مومن کی برتری کی سنت

سورہ آل عمران میں مثبت انداز میں بات کی گئی ہے۔یعنی وہ سبب جو کسی قوم کے رُشد میں مؤثر ہے پہلے فرمایا ہے:

"قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ۔"

تم سے پہلے مثالیں گزر چکی ہیں اب تم زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ جھٹلانے "والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔"(۱)

"هٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ۔"

"یہ (کتاب) عام انسانوں کے لیے ایک بیانِ حقائق ہے اور صاحبانِ تقویٰ کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔"(۲)

جنگ بدر میں جب مسلمان دشمنوں کے مدمقابل کھڑے تھے تو درحقیقت میدانِ

۱۔سورۂ آلِ عمران ۳۔آیت ۱۳۷

۲۔سورۂ آلِ عمران ۳۔آیت ۱۳۸

کارزار میں اپنی تاریخ رقم کررہے تھے یہ ایسی جنگ ہے کہ جس سے ان کی تقدیر کا تعین ہونا ہے اوران کی تاریخ کی بنیادیں استوار ہونی ہیں اگراس جنگ میں کامیابی وفتح ہوتی ہے تودشمن کی بنیادیں منہدم ہوجائیں گی۔اوراسی کے بعدترقی اورپیش رفت کریں گےلیکن اگرقوانین تاریخ سے بھرپورفائدہ نہ اٹھایااوراپنی ترقی وکامیابی کے لیے مؤثرترین ہتھیار سے استفادہ نہ کیااورموقع شناس نہ بنے اوردشمن کامیاب ہوگیاتوان کا قصہ تمام ہوجائے گا۔اسی لیے بعدمیں فرمایا:

”وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ “

”خبردارسستی نہ کرنا، مصائب پرمحزون نہ ہونا اگرتم صاحبِ ایمان ہوتوسر بلندی تمہارے ہی لیے ہے۔“(۱)

اگرآپ ہدف، مکتب اوراس کی تعلیمات پرمضبوط اورمحکم ایمان رکھتے ہیں اوراس راہ میں سستی وکاہلی کامظاہرہ نہ کریں اورمکمل طورپراستقامت وپائیداری کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں تویقیناً کامیاب وکامران ہوں گے۔(وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ،اورتم ہی بالاترہو) یعنی تاریخی، اجتماعی اورترقی کے لحاظ سے تم ہی آگے ہوگے۔اورپھرتم اعلیٰ منازل طے کرتے چلے جاؤ گے۔پس یہ برتری اوربلندی تمہارے ایمان اورسستی نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ اس کے فوراًبعدقرآن میں فرمایا:

اگرتمہیں کوئی مصیبت پہنچی ہے اگرتم نے جنگ میں زخم کھائے ہیں اورقتل ہوئے ہوتو دشمن نے بھی توزخم کھائے ہیں اورمصیبتیں دیکھی ہیں اورقتل ہوئے ہیں، کہیں ایسانہ ہوکہ چند مقتولوں اوراس نقصان کی وجہ سے تم ٹھنڈے پڑجاؤاورآگے نہ بڑھو۔اس کے بعدپھر قرآن فرماتا ہے: یہ قیدوبندکی صعوبتیں اورمشکلات ایسی ہیں جودیگراقوام میں بھی

۱۔سورۂ آلِ عمران ۳۔آیت ۱۳۹

تھیں۔(۱) یہاں صبر و تحمل کرنا ہے، پائیداری و استقامت کا مظاہرہ کرنا ہے اور مکتب سے وفاداری کا ثبوت دینا ہے تاکہ ایسی قوموں کے لیے تاریخ بلندی کی طرف سفر کرے۔

۴۔اقوام کے رہبروں کا کردار

کچھ اور آیات پیش خدمت ہیں جو اجتماعی قوانین سے متعلق ہیں سورۂ بنی اسرائیل کی آیات نمبر ۷۰ تا ۷۷ میں ارشاد ہے کہ:

”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔“

”اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے اور انہیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے اور انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے۔“

انسان کی عزت و برتری اور قدرت کے حوالے سے گفتگو ہو رہی ہے جسے خدا نے انسان کو عطا کیا جس سے یہ برّ و بحر کو مسخر کرے اور یہ انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان وجہ امتیاز بھی ہے۔ اور اس آیت کے بعد والی آیت بغیر کسی ربط و تعلق اور بغیر کسی وجہ کے اس آیت کے بعد واقع نہیں ہوئی بلکہ ان دونوں آیات کا آپس میں تعلق ہے۔ بعد والی آیت میں فرمایا کہ:

”يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا۔“(۲)

”قیامت کا دن وہ ہوگا جب ہم ہر گروہ انسانی کو اس کے پیشوا کے ساتھ

۱۔یہ اشارہ ہے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۰ سے (د)

۲۔سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔آیت ۷۱

بلائیں گے اور اس کے بعد جن کا نامہٴ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ اپنے صحیفہ کو پڑھیں گے اور ان پر ریشہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔''

انسان کی فضیلت اور عزت وتکریم کو بیان کرنے کے فوراً بعد جو آیات بیان ہوئی ہیں وہ چند مراحل پر مشتمل ہیں۔ اے انسان! ہم نے تجھے بہت فضیلت دی ہے بڑا قدر و قیمت والا خلق کیا ہے لیکن پہلی بات یہ کہ ایک دن آئے گا اور ہم ہر قوم وملت کو ان کے امام و پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔ یعنی رہبریت کا مسئلہ انسان کو مقامِ فضیلت تک پہنچانے اور قدر و قیمت عطا کرنے میں انتہائی مؤثر ہے۔ اگر لوگ چاہتے ہیں کہ اس کرامت وفضیلت کا احیا ہو اور وہ اس مقامِ عظمیٰ تک رسائی حاصل کریں تو انہیں دیکھنا چاہیے کہ انکے رہبر و راہنما اور پیشوا کیسے ہیں؟ وہ کیسے راہنمائی کرتے ہیں اور ان کا معاشرہ کس مکتب اور فکر کے سایہ میں آگے بڑھ رہا ہے اور کس طرح کی قیادت کے زیرِ سایہ زندگی گزار رہے ہیں۔ پس انسان کو جس عزت وتکریم سے نوازا گیا ہے اس میں رہبریت کا کردار اور اقوام وملل کے عروج اور رُشد وتکامل میں رہبریت کا مقام ایک ایسا نقطہ ہے جسے علیحدہ طور پر بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۔ رشد وبصیرت کا کردار

بعد والی آیت میں ارشادِ ربُّ العزت ہو رہا ہے:

''وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِیْلًا۔''

''اور جو (شخص) اسی دنیا میں اندھا ہے وہ قیامت میں بھی اندھا اور بھٹکا ہوا رہے گا۔''(۱)

۱۔ سورہٴ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۲۔

جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو یعنی ہدایت نہیں رکھتا ہو دل کی بصیرت میں فہم و فراست اور روشن خیالی سے عاری ہو تو ایسا شخص آخرت میں بھی اندھا ہے بلکہ اس سے برا کہ گمراہیوں کا شکار ہے یعنی اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنی حقیقی قدر و قیمت کو جانیں اور منزلِ کمال تک پہنچیں اور فضیلت کو حاصل کریں جو انسان کو نوازی گئی ہیں تو پست فکری، کج روی اور سیاہ دل سے اس کا حصول ممکن نہیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ وہ فرسودہ قوم بابصیرت بنے، ہدایت کی راہ پر گامزن ہو تا کہ کھوئی ہوئی شخصیت پھر سے لوٹ آئے اور ہدایت و ترقی کی راہیں کھلتی چلی جائیں۔

۶۔اصل مکتب کے تحفظ کی تاثیر

اب اس واقعہ کی طرف توجہ فرمائیں جس میں پیغمبر اکرمؐ کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ مکتب کے تحفظ، لوگوں کی ہدایت و راہنمائی اور وحیٔ الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے میں چھوٹی سی بھی غلطی ناقابلِ قبول ہے، اس حوالے سے زبان سے اظہار کیا دل میں بھی ایسی سوچ نہ آنے پائے۔ یہاں پر ایک تاریخی داستان کی طرف اشارہ ہے: جس میں دشمنوں نے رسول خداؐ کے سامنے بطور سازش ایک رائے پیش کی کہ ہم اسلام قبول کرتے ہیں لیکن کچھ شرائط کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ مثلاً فلاں بت ایک سال تک باقی رہے، ہم اپنے ہاتھ سے اپنے بتوں کو نہ توڑیں، امراء اور غرباء وفقراء کی نماز میں صفیں علیحدہ علیحدہ ہوں۔ اور اسی طرح دیگر شرائط کہ یوں کریں اور یوں کریں۔ البتہ میں اس آیت کی تفسیر میں نہیں جانا چاہتا اور نہ ہی اس آیت سے پیدا ہونے والے مسائل کو زیرِ بحث لانا چاہتا ہوں۔ میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ اس آیت کی روح پر تھوڑا بہت غور کر لوں اس کی روح اور حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو اس بات سے خبردار کیا جا رہا ہے کہ وحیٔ الٰہی کے پہنچانے میں کوتاہی بالکل قبول نہیں، یہ فکری انحراف اصلاً زبان تک نہ پہنچے یعنی حقیقتِ مکتب ہر حال میں محفوظ رہے اور کسی بھی صورت

میں قانونِ الٰہی پائمال نہ ہونے پائے۔

۷۔صالح رہبروں کے مقابل عوامی اقدام کا کردار

"وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا۔"

"اور یہ لوگ اس بات میں بھی کوشاں تھے کہ اس سرزمین سے آپ کے قدم اکھیڑ دیں اور اس طرح آپ کو یہاں سے نکال دیں اور اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ خود بھی آپ کے بعد زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے۔ یہی ہمارا دستور رہا ہے ان رسولوں کے بارے میں جنہیں ہم نے پہلے بھیجا ہے اور آپ ہمارے اس دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔"(۱)

وہ چاہتے تھے کہ آپ کے قدم اکھاڑ دیں اور اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو انہیں مہلت نہ دی جاتی یعنی وہ لوگ جو پاک صالح اور شائستہ راہنماؤں کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور ان کو اپنی سرزمین سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

یہ چند مسائل یعنی کسی قوم کی بہتری میں امام و رہبر کا کردار اس کی بقا میں فکری بیداری اور ہدایت کا عمل دخل، مکتب کی حقیقی تعلیمات کا تحفظ، الٰہی نظام اور شائستہ راہنماؤں اور ہادیوں کے ساتھ لوگوں کا رویہ، یہ ساری باتیں کسی بھی قوم کے عروج و زوال میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

یہ سب کے سب قوم و معاشرے کو بنانے، اسکی حفاظت و بقا اسے ترقی کی راہ پر

۱۔سورہ بنی اسرائیل ۱۷۔آیات ۷۶، ۷۷

گامزن کرنے اور منزلِ کمال تک پہنچانے یا انحطاط اور زوال اور تباہی و بربادی ہی کے علل وعوامل ہیں۔

بے جا توقع

ایسا اسلام جو خود یہ کہتا ہو کہ عزت وعظمت اور ترقی و پیش رفت آسمان سے نازل نہیں ہو جاتی 'مُفت ہر جگہ میسّر نہیں ہے' بغیر کسی قانون کے اور اقربا پروری کی بنیاد پر نہیں مل جاتی بلکہ کچھ قطعی اور غیر اختیاری قوانین کے تحت ممکن ہوتی ہے ایسے قوانین جو ہر قوم وملت' آئندہ وگزشتہ ہر ایک کے لیے یکساں ہیں۔ پھر کیسے ممکن ہو کہ معاشرۂ اسلامی میں یہ الٰہی قوانین لاگو نہ ہوں؟

جب قرآن علی الاعلان کہہ رہا ہے کہ ہم ظالم وستمگروں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ عیش پرستوں اور فاسق و فاجر افراد کو نابود کر دیتے ہیں۔ اور ظلم وفساد اور سرکشی قوموں کی بربادی کا باعث ہے۔ اب اگر کسی اسلامی معاشرے میں سرکش اور عیش پرست موجود ہوں اور سرکشی وفساد زیادہ ہو تو پھر یہ کہ الٰہی اصول فائدہ مند نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی مسلمان زہر کا پیالہ پی لے اور وہ زہر کوئی اثر نہ کرے؟

ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ زہر ہے اور یہ اپنا اثر دکھائے گا۔ اس طرح ظلم بھی معاشروں کو تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔ اب جب کسی قوم کی قیادت ورہبریت ایسے افراد کر رہے ہوں جو خود پسند اور عیش وعشرت کے متلاشی اور مال و دولت کے پجاری ہوں اور قیصر وکسریٰ کی شان وشوکت کو نافذ کر دینے والے ہوں۔ ظاہری لبادہ اسلام کا اوڑھ رکھا ہو۔ لیکن ان کی اندرونی کیفیت قیصر وکسریٰ سے کم نہ ہو تو کیا اس صورت حال میں بھی توقع کی جاسکتی ہے کہ امتِ مسلمہ کی قدر و قیمت اور عظمت باقی رہے گی اور وہ رُشد وترقی کی راہ پر گامزن ہوگی؟ نہیں بلکہ وہ تو تباہ و برباد ہو جائے گی۔

جب اسلام آیا اور پیغمبر اسلامؐ نے ہدایت کا کام شروع کیا تو پیش رفت اور تحرک وحیٔ الٰہی کے سایہ میں تھا۔ وحیٔ الٰہی ہی کے ذریعے سرور کائناتؐ نے قدم آگے بڑھائے اور ایک نئی امت کی تشکیل ہوئی' ان کی ضروریات کو پورا کیا اور انہیں متحرک و فعال بنایا۔ پیغمبر اکرمؐ کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ اس فرد کے زیر سایہ قدم بڑھیں جو خاندانِ وحی کی آغوش میں رہا ہو اور اس مکتب کو سب سے زیادہ جانتا ہو۔ اور وہی پوری امتِ مسلمہ کی رہبری کرے۔ لیکن کچھ اور لوگ اس منصب پر قابض ہو گئے لیکن چونکہ وحی الٰہی کے زیر سایہ قدم بڑھ رہے تھے اجتماعی حالات جس طرح بن چکے تھے' اسی کا خیال رکھتے ہوئے تھوڑا بہت ان کا خیال رکھتے ہوئے نظام چلانا پڑا۔ لیکن پھر سرور کائناتؐ کی رحلت کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ امت مسلمہ کی پیشوائی اور خلافت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باقاعدہ ایک مسئلہ بن گئی۔ مسئلہ وحی و قرآن' جس نے معاشرے کی ضروریات پوری کرنی تھیں اور اس پورے دستور کا اجرا کرنا تھا۔ اب وحی کے بتائے ہوئے اصولوں پر خلافت ملنے کی بجائے کئی اور راہیں منظر عام پر آئیں۔ بنابریں مجبور ہو گئے کہ وحی کو ایک تھیلے کی مانند کاندھے پر لٹکایا جائے اور خاص اجتماعی شرائط کے تحت آگے بڑھا جائے۔

اس ماجرے کو چند روز گزر گئے اور خلیفۂ سوم کا زمانہ آ گیا اور پھر بنی امیہ نے قدم جما لیے' ملوکیت اور بادشاہت نے پنجے گاڑ لیے اور قرآن سے اپنے اقتدار کی حفاظت اور بقا کے لیے کچھ رسمی ربط و تعلق برقرار رکھا۔ قرآن کو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنا لیا آیاتِ الٰہی کی تفسیر اس انداز میں کرنے لگے کہ جس سے ان کی حکومت اور قدرت و طاقت باقی رہ سکے۔ چونکہ وحی کے سایہ میں نہ رہے اور ان کی خلافت و حکومت غیر قرآنی تھی اس لیے اسلامی معاشرے میں نفوذ پیدا نہ کر سکی۔ وحی کے ساتھ ساتھ اور اس کے سایہ میں نہ چلنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس مکتبِ عظیم اور اس بادشاہت اور حکومت کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ خلیفہ اس لیے سیاسی احکامات جاری کرتا تا کہ ان کی حکومت محفوظ رہ سکے۔

معاشرے کی ایک اساس اور بنیاد اسلام اور وحیٔ الٰہی بھی ہے جس کی توجیہ وتفسیر اس طرح ہونی چاہیے کہ اس کی اصلیت اور حقیقت محفوظ رہ سکے۔ اس کی اصلیت خلافت ہے اور بقیہ سب چیزیں ضمنی ہیں۔ البتہ میں اس بحث میں نہیں جانا چاہتا لیکن میری نظر میں یہ ایک انتہائی اہم اور دقیق بحث ہے کہ تاریخِ اسلام کے مختلف ادوار میں جو فاصلہ وحیٔ الٰہی اور حکومت واقتدار کے درمیان ہوا ہے اسے کیسے بیان کیا جائے اور تحقیق کے مرحلے کو طے کیا جائے؟ انسان دیکھتا ہے کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مکتب معاشرے میں فقط چند رسم و رواج کی حد تک باقی رہ گیا ہے۔

گزشتہ اعتراض کی حد تک جو کچھ بیان ہوا اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ البتہ ہماری خواہش تھی کہ ہم فقط اس بات کی طرف اشارہ کر دیں کہ اگر اسلام خود اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ انسانی معاشرے پر کچھ قوانین کارفرما ہیں اور ملتِ اسلامی ان قوانین سے ماورا بھی نہیں۔ اب اگر یہ فساد اور زوال کے علل واسباب جیسے طبقاتی اختلاف، ظلم، خود پسندی، مال و دولت کی خواہش اور بت پرستی اسلامی معاشرے میں قدم جما لیں تو اس معاشرے اور امت کی ہلاکت وتباہی کا انتظار کیجیے۔

اسلام کے عظیم نتائج

ایک اور نکتہ جس کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام صرف دس بارہ سال فعال رہا ہے صرف مدینہ میں دس سال عملی میدان میں آیا ہے۔ اس لیے کہ مکہ کے تیرہ سال میں تو کوئی معاشرہ تشکیل نہ دیا جا سکا اور کوئی نظام قائم نہ ہو سکا، حکومت کا کوئی تصور موجود نہ تھا، نہ بیت المال کا کوئی سلسلہ تھا۔ ایک ایک کر کے لوگ مسلمان ہوتے رہے پھر آہستہ آہستہ مسلمان اکھٹے ہونے لگے یہاں تک کہ مدینہ میں ایک نیا معاشرہ تشکیل پایا اور حکومت قائم ہوئی۔ فقط دس سال مدینہ میں حکومت اسلامی رہی اور

رسول خداؐ کی رحلت کے بعد حکومت بھی اپنے محور سے نکل گئی۔ یا زیادہ سے زیادہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور امام حسن مجتبیٰؑ نے چار پانچ سال اسلامی حکومت قائم کی جس میں اندرونی خلفشار تھا اور امت اندرونی مسائل کا شکار رہی اور مشکلات میں گھر گئی' اس صورتِ حال میں ایک ایسے مکتب کو کیسے پوری دنیا پر لاگو کرنا چاہتے ہیں کہ جو بمشکل پندرہ سال حکومت قائم کرسکا؟

یہ بات ٹھیک ہے کہ رحلتِ پیغمبرؐ کے بعد حکومت اپنے اصلی محور و مرکز سے ہٹ گئی اور ابتدا میں یہ ایک چھوٹا سا انحراف تھا جس نے بعد میں ایک بڑے انحراف کی صورت اختیار کرلی اور نتیجتاً ۱۸۰ درجے کا زاویہ بن گیا کہ اب اگر ایک طرف کھڑے ہوں تو دوسرا سِرا نظر ہی نہیں آتا' فاصلہ اس حد تک زیادہ ہوگیا ہے کہ ایک ضلع دنیا کے اس طرف اور دوسرا ضلع دنیا کے اس طرف ہوگیا ہے۔ اس کے باوجود ہم اسلام کو فراموش نہ کریں۔ اس لیے کہ اسلام ایک درخشاں نظام اور عظیم دستور ہے۔ اسلام نے پوری دنیا کو ایک نئی سوچ دی ہے۔ اسلام نے فلسفہ' حقوقِ اجتماعی روابط' ثقافت' تہذیب و تمدن اور دیگر علوم کی شکل میں انسانیت کو ایک نیا آئین دیا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ اسلام اپنے محورِ اصلی سے ہٹ گیا ہے مگر اسلام کے مختلف پہلو ہیں' مثلاً اخلاقی' اجتماعی' فلسفی' ثقافتی وغیرہ۔

دوسری صدی کے ابتدا میں اسلامی حکومت اتنی مضبوط تھی کہ کوئی حکومت اس کے مقابلے کی طاقت نہ رکھتی تھی۔ اسلام نے تہذیب و تمدن' علوم و فنون' مفکرین' مکاتب' یونیورسٹیز' لائبریریوں اور علمی حلقوں میں عظیم تحریک برپا کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے عیسائیوں کے لیے خوابِ غفلت سے بیدار ہونے اور جہالت اور تاریکی سے نکل کر اسلامی تہذیب و تمدن سے آشنا ہونے میں صلیبی جنگوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

اسپین (اندلس) میں مسلمانوں کے علمی کارناموں کی وجہ سے عیسائیوں نے آخرکار اس سرزمین پر قبضہ کرلیا لیکن جو یادگاریں اسلام کی ابھی تک موجود ہیں قابلِ غور ہیں۔ البتہ

کہنا چاہیے کہ تاریخ علمِ بشریت کی کم وبیش پانچ چھ صدیاں اسلامی ممالک غالب رہے ہیں اور علم و حکمت اور تہذیب و تمدن میں سرِ فہرست رہے ہیں۔

ایک ظالمانہ فیصلہ

ممکن ہے کوئی اعتراض کرے کہ مسلمانوں کی اس پیش رفت کی وجہ فوجی طاقت تھی اور فوجی طاقت بہت سوں کو پہلے بھی حاصل ہوتی رہی ہے' مثلاً سکندر اعظم یا مغلوں نے بھی وسیع سرزمینوں کو فتح کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا فیصلہ ظلم ہے کیا ایسی فتح جس کے نتیجے میں حملہ آوروں نے اپنا معاشرتی' فکری و فلسفی نکتہ نگاہ سے وسیع سرمایہ زیرِ اثر قوم پر لاد دیا اور قوم نے نہ صرف یہ کہ ان حملہ آوروں کے مقابل جنہوں نے انہیں یہ سوغات بخشی تھی مزاحمت نہ کی بلکہ دروازوں کو بھی ان پر کھول دیا تا کہ اپنی ان سوغاتوں کے ساتھ انکی سرزمین میں وارد ہوں۔ اب ایسی صورتحال میں فوجی دباؤ کی تفسیر کس طرح کی جاسکی ہے؟ دوسری جانب اگر زبردستی اور تلوار کی زد پر انہیں محکوم بنا دیا گیا ہو' تو جیسے ہی نیزے و تلوار کا زور ٹوٹا انہیں ان افراد کے خلاف طوفان برپا کر دینا چاہیے تھا جنہوں نے اس ثقافت کو ان پر مسلط کر دیا تھا۔ اور تمام تر برآمدی ثقافت کو برباد کر دینا چاہیے تھا اور جڑ سے اکھاڑ پھینکا چاہیے تھا۔ البتہ ایرانی مسلمانوں نے اسلام کی تاریخ میں اہم ترین فلسفی' علمی' فکری' فقہی اور روائی خدمات انجام دی ہیں۔

ہم یہاں اس بات پر بحث نہیں کرنا چاہتے کہ اسلام کے لیے ایرانیوں کی خدمات کس قدر تھیں۔ بلکہ ہم اس زاویہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں کہ آگ سے زیادہ گرم ترپیالے اور ماں سے زیادہ مہربان تر دائی کی مانند ایک گروہ وطن کے لیے پریشان ہے' اس گروہ کا کہنا ہے کہ چودہ سو سال قبل ایک وحشی قوم آئی اور ہماری سرزمین پر قبضہ کر کے ہمارے کلچر

اور تمدن کو برباد کر دیا! اب ہمارا یہاں سوال یہ ہے کہ آپ کونسے کلچر کونسے تمدن اور کونسے آثار کی بات کر رہے ہیں؟ چند کتابیں' آپ اس زمانے کی کتنی لائبریریاں اور کتنے دانشوروں کے نام بتا سکتے ہیں؟ ہم یہاں بحث نہیں کرنا چاہتے یہ بہت طویل بحث ہے جس کے اندر خود بہت زیادہ مباحث موجود ہیں۔ اور اس سلسلے میں آپ اس موضوع کی بعض کتابوں کی جانب رجوع کر سکتے ہیں (ا) لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اسلام کو زبردستی اس سرزمین پر مسلط کیا گیا ہے تو پھر اس سرزمین کے لوگوں نے جو خدمات انجام دی ہیں عربی ادبیات صرف ونحو کے لیے جو کام کیے ہیں تفسیر اور قرآن کریم کے لیے جو زحمتیں اٹھائی ہیں اور دینِ اسلام کے مختلف موضوعات پر جو امور انجام دیئے ہیں اسکی کیا وجہ ہے؟

پس معلوم یہ ہوا کہ اس سوغات کو انہوں نے دل و جان سے قبول کیا ہے۔ اور یہ خشک سیاسی وفوجی تبدیلی نہیں تھی بلکہ ایک مکتبی واعتقادی تبدیلی تھی اور ایک فکری ونظریاتی تحریک تھی جو مختلف سرزمینوں پر وارد ہوئی اور اپنے ساتھ معاشرتی اجتماعی اصول وضوابط 'ثقافت' تمدن' افکار بھی لے کر آئی۔ لہٰذا اگر ایرانی عوام نے اسلام آنے کے کچھ عرصہ بعد خلافت اور مرکزِ حکومت کے خلاف قیام کیا تو یہ اس سرزمین پر قیام اسلامی نعروں کے ساتھ ان حکومتوں کے خلاف تھا جو اسلامی نظام کے برخلاف چل رہی تھیں۔ جو پرچم لہرائے گئے وہ ہرگز بھی قرآن اور اسلام کے برخلاف نہ تھے۔ مثال کے طور پر وہ کہا کرتے تھے کہ یہ حکومت جس نے مرکزِ خلافت کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے یہ نسلی (موروثی) حکومت ہے اور دینِ اسلام سے دور ہو چکی ہے۔ وہ عدالت وبرابری اور وہ اصل اسلامی وانسانی حکومت کہاں ہے؟

وہ حقوق سے متعلق مسائل جو اسلام نے دنیا کو سکھائے' پھیلائے اور اجتماعی مطالب

ا۔ جیسے شہید مطہری کی کتاب "خدماتِ متقابل اسلام وایران" (د)

بتائے' عرصہ گزرنے کے بعد ان مسائل نے دنیا کے کسی کونے سے مکتبِ حقوق کے عنوان سے یا کسی اور عنوان سے سر اٹھایا' واقعاً یہ بات قابلِ مطالعہ ہے کہ ثقافت' تفکر اور عادلانہ انسانی روابط کو پھیلانے میں اس کا کتنا بڑا کردار ہے۔ اگرچہ یہ تمام مکاتب سو فی صد مادی ہی ہیں لیکن انہوں نے انبیاؑ کے مکتب سے الہام لیا ہے۔ سب سے پہلے انبیاؑ ہی نے عدالت کی آواز اٹھائی ہے۔ کلمۂ حق کو انبیاؑ نے ہی بلند کیا ہے مساوات و بھائی چارگی اور ایسے ہی بہت سے دیگر مسائل کو انبیاؑ اور ادیان الٰہی نے ہی بیان کیا ہے۔ یہ سب واقعاً قابلِ تحقیق و مطالعہ ہے جس طرح علمی مسائل میں فزکس' کیمیا' اور ریاضی کے اہم فارمولوں کو مسلمان سائنسدانوں نے کشف کیا اگرچہ انہیں بھلا دیا گیا' لیکن کتنے ہی فکری' معنوی' اور اجتماعی مسائل ہیں جن کا حل دینِ اسلام نے ہی پیش کیا ہے۔

بنا بریں مسئلے کو اتنا معمولی اور چھوٹا نہ کیا جائے کہ یہ کہا جانے لگے کہ اسلامی انقلاب یا اسلامی تحریک صرف چند سال کے لیے مدینہ اور اطراف کے شہروں تک ہی انجام پائی اور پھر نابود ہو گئی۔ وہ زمانہ کہ جب حضرت علی علیہ السلام حکومت میں آئے اور اسلام کو نافذ کرنا چاہا اس دوران مسلسل داخلی خانہ جنگی میں گرفتار رہے اور اسکے نفاذ کا موقع نہ مل سکا۔ پس آپ اس تحریک یا انقلاب کے کس طرح دعویدار ہو سکتے ہیں جو عالمی انقلاب ہے؟ نہیں اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو تمام حصوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور اسکے بارے میں مطالعہ کرنا چاہیے۔

کبھی کبھی اسلامی انقلاب کا ایسے مکاتب سے موازنہ کیا جاتا ہے کہ جن کی عمر ابھی صرف ۶۰ یا ۷۰ یا ۸۰ سال کی ہے۔ خیر چھوڑیں اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہوتا کیا ہے (۱)

۱۔ شہید باہنر کس قدر با بصیرت' روشن خیال اور دور اندیش تھے کہ انہوں نے جس طرح مادی مکاتب کی تباہی' بطلان اور سقوط کی پیش بینی کی تھی ہم تباہی کے ان واضح نمونوں کے گواہ ہیں۔ (د)

ناقص موازنہ

ایک نکتہ جو اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے درمیان موازنے سے متعلق قابلِ مطالعہ ہے وہ یہ کہ ایک ترقی یافتہ ملک کا پسماندہ ملک سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ان موازنوں میں پسماندہ غیر اسلامی ممالک کی مثال کیوں نہیں دی جاتی؟

افریقہ کے بعض ممالک ہیں کہ جن میں اکثریت مسلمان بھی نہیں ہے لیکن جب جاپان یا جرمنی وغیرہ سے ان کا موازنہ کیا جاتا ہے تو یہ انتہائی پسماندہ ممالک شمار ہوتے ہیں۔ ایسے بھی ممالک ہیں جو ''بودائی'' مذہب رکھتے ہیں اور کمترین اجتماعی حیثیت اور پسماندگی کا شکار ہیں۔ ایسے بھی ممالک ہیں جو مشرق کی سمت اور چھاونیوں پر مشتمل ہیں(۱) اور سیاسی، فوجی، صنعتی، اقتصادی لحاظ سے نہایت پسماندہ ہیں۔

ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ جب مرد و زن کے درمیان موازنے کا موضوع بیان کیا گیا اور یہ موضوع یہ بحث بہت زیادہ طولانی ہوتی گئی کہ مرد و زن کے حقوق کیا ہیں۔ ایک میگزین آیا تھا جس میں ایک بہت ماڈرن ڈاکٹر خاتون کی تصویر تھی اسکے سامنے صفحے کے آخری کونے میں ایک ضعیف ناتوان محنت کش غریب مزدور کی تصویر تھی۔ ساتھ میں لکھا تھا کہ ''ذرا انصاف سے بتائیں کہ یہ بہتر سمجھ سکتے ہیں یا وہ؟

اس بوڑھے کمزور ان پڑھ، پسماندہ مزدور مرد کی سوچ اور اسکی شخصیت بالاتر ہے یا اس تعلیم یافتہ ماڈرن ڈاکٹر خاتون کی۔۔؟ وہ جب موازنہ کرتے ہیں تو ایک پسماندہ فرد کا ماڈرن فرد سے موازنہ کرتے ہیں۔ اگر آپ کو موازنہ کرنا ہی ہے تو جناب بوڑھے مرد کے مقابل اسی جیسی بوڑھی ان پڑھ، پسماندہ خاتون لے کر آئیں پھر موازنہ کریں یا اس ڈاکٹر خاتون کے سامنے ایک مرد ڈاکٹر کا موازنہ کریں۔

۱۔ یہاں مراد سابقہ سویت یونین روس ہے

اگر مسئلہ جانچ کا ہے تو پھر ایک پسماندہ اسلامی ملک کا ایک ترقی یافتہ غیر اسلامی ملک سے موازنہ کیوں کرتے ہیں؟ پھر ہم نے عرض کیا کہ مطالعہ ضروری ہے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ علاقائی یا جگہ کے عوامل کس حد تک مؤثر رہے ہیں؟ جغرافیائی عوامل اور سابقہ تاریخی عوامل کیسے تھے؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومتیں، خلافتیں اور وہ سلسلے جنہوں نے ایک قوم پر حکومت کی ہے، پھر رسم ورواج، گزشتہ تاریخ، کھانا پینا، رہن سہن، جو ہمیشہ سے ان کا طرز زندگی تھا اور بعد میں دینِ اسلام میں شامل ہوا، پس ضروری ہے کہ ان ہی معاشرتی وقومی روایات کی تحقیق کی جائے جو اس قوم میں شامل ہو چکی تھیں اور امت کی تاریخ بنانے، اسکی ترقی اور سقوط وتباہی میں اثر انداز تھیں۔ بنابریں ہم اسلام کو خود ایک مکتب کے عنوان سے اسکے تمام تر مؤثر عناصر کے ساتھ مکتب کی نظر سے مطالعہ کریں پھر فیصلہ کریں گے کہ کیا یہ دینِ اسلام ایک قوم بنا سکتا ہے؟

ترقی کا معیار

میں یہاں بحث کے صرف آخری حصے کی جانب اشارہ کروں گا اور وہ یہ ہے کہ ترقی نظر آتی ہے اور پسماندگی بھی اسی طرح ہے، البتہ یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ کیا ترقی تمام سمتوں کے لیے ہر پہلو کے لیے ہے یا نہیں؟

اگر ایک فرد بہترین استری شدہ کپڑے پہنے خوب تیار ہوا ہو اور جدید ترین ماڈل کی نئی گاڑی میں بیٹھا ہو، عمدہ ترین برانڈ کا سگار اسکے ہونٹوں کے درمیان دبا ہو، قیمتی چشمہ اسکی آنکھوں پر رکھا ہو، تو کیا یہ ایک ترقی یافتہ، باکمال اور اعلیٰ نسب انسانیت کی علامت ہے؟ کیا صرف ظاہری زرق برق، بہترین گاڑی اور تمام ترقی یافتہ عناصر مل کر ایک قوم اور معاشرے کو تشکیل دیتے ہیں؟ کیا انسان نے ترقی کے لیے تمام تر ضروری مسائل کو حل کر لیا ہے اور وسائل تک دسترس حاصل کر لی ہے؟ یا اب بھی بہت سے مسائل ایسے ہیں جنہیں

مل کر حل کرنا ضروری ہے؟ بہت سے اجتماعی‘ انسانی‘ اخلاقی اور معنوی مسائل ہیں جواب تک مادی ترقی یافتہ انسان کی دسترس سے بہت دور ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مشرقی انسان یا مسلمان یا دینداران سب کو حاصل کر چکا ہے لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ایک نکتۂ نظر سے ایک پہلو سے دیکھ کر فیصلہ نہ کریں۔ بہت سے ایسے مسائل ہیں جو ایک انسان یا معاشرے کی ترقی یا کمال میں مؤثر ہیں۔

ابھی ایک خوشحال انسانی معاشرے کی تاریخ کو زیادہ وقت نہیں گزرا ہوتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انکی آسائشات‘ آرام و خوشحالی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ ان آخری ۵۶ سالوں میں ان کی خوشحالی دو بڑی عالمی جنگوں اور سینکڑوں اندرونی جنگوں پر ختم ہوئی وہ بھی تمام تر فسادات‘ ظلم و جور‘ بھوک پیاس‘ ناانصافی اور بے رحمی کے ساتھ۔

صرف ایک فرد یا ایک حصے کو دیکھ کر صحیح فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کیا انسانیت نے ترقی کر لی ہے یا نہیں؟ کیا انسانیت انسان بن گئی ہے یا ابھی تک حیوانیت کے مرحلے میں ہے کہ صرف اپنی غذاؤں کو لذیذ بنالیا ہے اپنے گھروں کو خوبصورت کر لیا ہے اور اپنے پنجے تیز کر لیے ہیں؟ ابھی تک ایک ترقی یافتہ انسان کے لیے اصل اسلامی معیارات اور ان چیزوں کے درمیان بہت فاصلہ ہے جنہیں ترقی کہا جا رہا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ ہم نے جس پہلو‘ جس سمت بھی اشارہ کیا بحث کا حق ادا نہیں کر سکے۔ انشااللہ اگلے تحقیقی مباحث میں محققین و شوقین اور مطالعہ و گہرے تفکرات کے تشنہ افراد اصل اسلامی مطالب کو آگے بڑھائیں گے۔

❁❁❁

کسی قوم کی بہتری میں امام و رہبر کا کرداراس کی بقامیں فکری بیداری اور ہدایت کا عمل دخل، مکتب کی حقیقی تعلیمات کا تحفظ، الٰہی نظام اور شائستہ راہنماؤں اور ہادیوں کے ساتھ لوگوں کا رویہ، یہ ساری باتیں کسی قوم کے عروج وزوال میں بڑااہم کردارادا کرتی ہیں۔

"زندگی زیبا است اما شهادت زیباتر"

"عاشقانِ شهدِ شهادت"

" یاد شهداء کمتر از شهادت نیست."

اللهم عجل لولیک الفرج